Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1960ء

صدرِ محترم۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے فرمایا

ہمارا سب سے مقدس فریضہ یہ ہے کہ ہم اس آئیڈیالوجی کا احیاء اور استحکام کریں جس کی رو سے پاکستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ پاکستان محض ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف ہے۔ ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔

(راولپنڈی کی تقریر۔ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۵۹ء)

FIELD MARSHAL MOHAMMAD AYUB KHAN

Our most sacred duty is to revive and strengthen the ideology which brought Pakistan into being as an Independent Sovereign State. Pakistan is not merely the name of a country inhabited by eighty million people. By Pakistan we mean a people who own and honour certain moral and spiritual values based on Islam. The so-called modern men consider it out of fashion to talk of Islam. Such men are to be pitied.

(Rawalpindi, 6 March 1959)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون: ۷۵۰۰	قیمت فی پرچہ	بدل اشتراک
خط و کتابت کا پتہ	ہند و پاکستان سے	ہند و پاکستان سے سالانہ: آٹھ روپے
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور	بارہ آنے	غیر ممالک سے: ۱۶ شلنگ

نمبر ۱۰	اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء	جلد ۱۳

فہرست مضامین

لمعات ۲

محمدؐ کی کہانی — خدا کی زبانی (محترم پرویز صاحب) ۹

سلیم کے نام (محترم پرویز صاحب) ۲۹

قائدِ اعظمؒ (محترم صفدر سلیمی صاحب) ۴۱

آخری سہارے (آپ بیتی) (محترم عنایت اللہ صاحب) ۵۷

نقد و نظر ۶۸

لغات القرآن (جلد دوم) ۷۱

باب المراسلات (مسئلہ اشاعتِ اسلام) ۷۳

رابطہ باہمی ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

جن لوگوں نے تحریک پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ، خالی الذہن ہو کر، بدقت نظر کیا ہے وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ پاکستان کو اتنا نقصان انگریز اور ہندو نے نہیں پہنچایا جتنا مسلمان قومیت پرستوں نے پہنچایا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ اسلام کی اس بنیادی حقیقت پر تھا کہ قرآن کی رُو سے قومیت کی اساس، اشتراکِ وطن نہیں بلکہ آئیڈیالوجی (دین) کا اشتراک ہے۔ انگریز یا ہندو، مطالبۂ پاکستان کی مخالفت سیاسی وجوہات پر کر سکتے تھے۔ انھیں یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا تھا کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے ان کے دین کی رُو سے غلط ہے۔ گاندھی جی نے جب کبھی یہ کہنے کی کوشش کی کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان نجی معاملہ ہے۔ اسے سیاست کے میدان میں نہیں لانا چاہیئے۔ قائد اعظمؒ نے انھیں فوراً ٹوک دیا اور برملا کہہ دیا کہ آپ ہندو مت کے متعلق جو جی میں آئے کہہ سکتے ہیں۔ اسلام کے متعلق کسی قسم کے فتوے دینے کا حق آپ کو حاصل نہیں۔ لیکن اس میدان میں مسلمان نیشنلسٹ آگے بڑھے اور جو بات انگریز اور ہندو کہنا چاہتے تھے لیکن نہیں کہہ سکتے تھے، وہ بات انھوں نے کہنی شروع کی اور آخر تک کہتے رہے۔ یعنی یہ کہ اسلام میں قومیت کا مدار وطن کا اشتراک ہے۔ نہ کہ دین کا اشتراک۔ مسلمان قومیت پرستوں کا یہی انداز مخالفت تھا جس کی وجہ سے پاکستان کی جنگ اتنا طول کھینچ گئی۔ اور بالآخر جب پاکستان بنا بھی تو اس انداز سے کہ اس کے وہ اجزاء جو اس کا سر (لحاظ سے) لاینفک حصہ تھے، بھارت کے ساتھ ملا دیئے گئے۔ اور یوں اس کی وحدت ٹکڑوں میں بٹ گئی ـــــ یہ پانی کے جھگڑے، کشمیر کا تنازعہ اور اسی قسم کے دیگر مسائل اسی غلط بنیاد کا نتیجہ ہیں جس کی بنیادی ذمہ داری مسلمان قومیت پرستوں کے سر پر عاید ہوتی ہے۔

ملک تقسیم ہو گیا۔ پاکستان وجود میں آ گیا۔ قومیت کے مدار کا مسئلہ بھی طے ہو گیا۔ لیکن ان (مسلم) قومیت پرستوں کا ابھی تک یہ عالم ہے کہ یہ کسی نہ کسی بہانے قومیت کے سوال کو نت نئے دن اچھالتے رہتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تشکیل پاکستان سے ان لوگوں کو جو شکست فاش ملی، اس کے زخم ابھی تک ان کے دل سے مندمل نہیں ہوئے۔ ان کی دلی آرزو

یہی ہے کہ کسی طرح بھارت اور پاکستان کی تقسیم ختم ہو جائے اور (خدانخواستہ) دونوں ملک مل کر پھر ایک ہو جائیں تاکہ وہ تحریکِ پاکستان کے حامیوں سے (فاتحانہ انداز میں) کہہ سکیں کہ ـــــ کیوں؟ ہم نہ کہتے تھے!۔

مسلمان قومیت پرستوں کے اس قسم کے شاخسانہ کی تازہ مثال، ڈاکٹر سید محمود صاحب کا وہ طویل مقالہ ہے جو جریدہ "اسٹیٹسمین" (انڈیا) میں عین اس وقت شائع کیا گیا ہے جب پنڈت نہرو (نہری پانی کے معاہدہ کے سلسلہ میں) پاکستان آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس مقالہ کو موقر روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" (لاہور) نے اپنی ۴ ستمبر کی اشاعت میں شائع کیا ہے اور اس پر تنقیدی مقالہ افتتاحیہ بھی لکھا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود، تحریکِ پاکستان کے اولین مخالفین میں سے ہیں۔ یہ بہار کی (کانگریسی وزارت میں) ۱۹۳۷-۳۹ء اور پھر ۱۹۴۶-۵۲ء میں وزیر رہے۔ اور اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں ہندوستان کی مرکزی حکومت میں وزیر مقرر ہوئے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں میں انھیں خاص شہرت حاصل تھی۔ یہ اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم محض ایک سیاسی واقعہ تھا یہ درحقیقت ایک خاندان کے دو افراد میں تقسیم ترکہ کا جھگڑا تھا.....
لیکن تقسیم ترکہ کے اس جھگڑے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی نہیں رہے۔ صدیوں سے ہماری روایات مشترک چلی آتی ہیں۔

تقسیم کے بعد، تنازعات کا ذکر کرتے ہوئے، ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں۔

اس وقت تک جتنے تنازعات پیدا ہوئے ہیں وہ ایک خاندان کی دو شاخوں میں، مشترکہ وراثت کی تقسیم کے تنازعات ہیں۔ ان میں کوئی اصولی اختلاف کارفرما نہیں ہے۔

مسلمان قومیت پرستوں کا یہی طرزِ عمل تھا جس نے تحریکِ پاکستان کے دوران، ہندوؤں اور مسلمانوں میں عادلانہ اور مصالحانہ سمجھوتہ نہ ہونے دیا۔ اور ان کا یہی طرزِ عمل اب بھی، ان دونوں ملکوں میں باعزت اور پائیدار مصالحت کے راستہ میں حائل ہے اور جب تک وہ اپنے اس طرزِ عمل سے باز نہیں آئیں گے، حائل رہے گا۔ وہ ہندوؤں کو ہمیشہ یہ بتانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں (اور کر رہے ہیں) کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی اصولی اور بنیادی اختلاف نہیں۔ یہ دونوں ایک ہی خاندان کی دو شاخیں ہیں اور ان کا جھگڑا محض تقسیم ترکہ کا جھگڑا ہے جس کے بعد بھی یہ آپس میں بھائی بھائی رہتے ہیں۔ یہ نظریہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ ہندو اور مسلمان نہ کبھی بھائی بھائی تھے نہ بھائی بھائی ہو سکتے ہیں۔ اسلام کی رو سے اخوت (بھائی بھائی ہونے) کا رشتہ دین کے اشتراک سے وابستہ ہے۔ جس دن کوئی غیر مسلم، اسلام اختیار کر لیتا ہے وہ تمام مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے۔ اور اپنے حقیقی غیر مسلم بھائی کا بھی بھائی نہیں رہتا۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کی بنیاد پر قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ

پاکستان اس دن وجود میں آ گیا تھا جب یہاں (ہندوستان میں) پہلا غیر مسلم، مسلمان ہوا تھا۔ جونہی کوئی ہندو مسلمان ہوا وہ نہ صرف مذہبی حیثیت سے اچھوت ہو گیا بلکہ معاشرتی، معاشی، تمدنی ہر لحاظ سے ہندو جاتی سے کٹ گیا.....
ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ہی شہر اور ایک ہی بستی میں رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کبھی ایک قوم نہیں

بن سکے۔ وہ ہمیشہ الگ الگ عناصر رہے ہیں۔

دوسرے مقام پر انھوں نے کہا تھا کہ

ہندو ازم اور اسلام عام مفہوم میں مذہب ہیں، لیکن یہ درحقیقت دو الگ الگ نظامہائے زندگی ہیں اور یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم بن جائیں گے۔

لہٰذا ہندوؤں اور مسلمانوں کا اختلاف، نہ ہی اُس وقت دو بھائیوں کا اختلاف تھا اور نہ ہی اب دو بھائیوں کا اختلاف ہے۔ ان کا اُس وقت اختلاف بھی بین الاقوامی (دو قوموں کا باہمی) اختلاف تھا اور آج بھی ان کے اختلاف کی یہی نوعیت ہے۔ مسلمان قوم پرستوں نے اُس وقت بھی ہندوؤں کو اس دھوکے میں رکھا کہ یہ اختلاف دو بھائیوں کا اختلاف ہے جو چند سر پھرے لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد یہ اختلاف خود بخود مٹ جائے گا۔ یہ حضرات اب بھی ہندوؤں کو اسی دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ یہ اختلاف و تفریق محض عارضی ہے جو چند دنوں کے بعد ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے اُس وقت ہندوؤں کو جس دھوکے میں رکھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندو لیڈروں میں سے کسی نے بھی تقسیم ہند کو ایک بنیادی اور فطری حقیقت کے طور پر قبول نہ کیا بلکہ طوعاً و کرہاً تسلیم کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر محمود صاحب نے اپنے مقالہ میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ ان لیڈروں نے تقسیم ہند کو بطیبِ خاطر قبول نہیں کیا تھا۔ گاندھی جی کے متعلق تو انھوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں، دہلی میں جشنِ آزادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو وہ کلکتہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ اس جشنِ مسرت میں شریک نہیں ہوں گے تو انھوں نے جواب میں کہا کہ

مجھے اس آزادی کی خوشی ہو وہ اس کے جشن منانے کے لئے یہاں ٹھہرے۔ مجھے تو اس کی کوئی خوشی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ گاندھی جی کا ارادہ تھا کہ وہ پاکستان میں آکر مقیم ہو جائیں۔ اور اس کے لئے انھوں نے خود ڈاکٹر محمود صاحب کو ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا۔ گاندھی جی کا اس سے مقصد کیا تھا اس کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے اشارۃً بات واضح کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

اس حقیقت کا سب کو علم ہے کہ گاندھی جی نے کئی بار یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جو لوگ ہندوستان سے پاکستان کی طرف اور پاکستان سے ہندوستان کی طرف (بطور پناہ گزیں) آ گئے ہیں، انھیں پھر سے اپنے وطن کی طرف لوٹ جانا چاہیئے۔ کیا گاندھی جی کا پاکستان میں جا کر اقامت پذیر ہو جانے سے منشا اس مقصد کا حصول تھا یا اس سے مقصد خود تقسیم ہند کی مخالفت کی مہم کو جاری رکھنا تھا جس کا اظہار انھوں نے ۱۹۴۷ء میں کیا تھا؟

گاندھی جی تقسیم ہند کے اس قدر مخالف کیوں تھے اور تقسیم ہند کے بعد بھی کیوں چاہتے تھے کہ دونوں مملکتیں پھر سے ایک ملک بن جائیں، اس کا جواب خود ڈاکٹر محمود صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

ایک مرتبہ گاندھی جی نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ "گاندھی ایک اچھا آدمی ہے اور ہندو مسلم اتحاد بھی اچھی چیز ہے اس لئے گاندھی اس پکار کو برابر دہرائے جا رہا ہے۔" اس پر میں نے ان سے کہا کہ اگر بات یہ نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر نہایت تاسف انگیز انداز میں کہا "اگر ہندو مسلم اتحاد نہ ہوا تو ہند تباہ ہو جائے گا۔" میں نے اس پر تعجب سے کہا کہ کیا تقسیم ہند کے بعد بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ انھوں نے بلا تامل جواب دیا کہ "بیشک میرا اب بھی یہی خیال ہے۔"

آپ نے غور فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد اور تقسیم ہند کو مٹا کر اکھنڈ بھارت کے جس خیال نے گاندھی جی کے دل کو اس قدر طلسم پیچ و تاب بنا رکھا تھا، اس کا محرک جذبہ کیا تھا؟ یہ کہ اگر ایسا نہ ہوا تو "ہند و تباہ ہو جائے گا"۔ مہاتما جی یہ سب کچھ ہندوؤں کو تباہی سے بچانے کے لئے کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ جذبہ کسی طرح بھی تعجب انگیز نہیں۔ وہ ہندو جاتی کے لیڈر اور نیشنلزم کے پرستار تھے۔ اور نیشنلزم کا بنیادی تقاضا اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے، دوسری قوم کا نہیں۔ لیکن کوئی ان مسلم قومیت پرستوں سے پوچھے (جن کی ترجمانی اس وقت ڈاکٹر سید محمود صاحب فرما رہے ہیں) مہاتما جی تو ہندو مسلم اتحاد اور وحدت ملک کے لئے اس لئے مضطرب و بیقرار تھے کہ اس میں ہندوؤں کی سلامتی کا راز پنہاں تھا۔ آپ حضرات متحدہ قومیت اور وحدت ملک کی حمایت کس لئے کر رہے تھے؟ کیا اسی لئے کہ اس میں ہندوؤں کی سلامتی تھی؟

اب ڈاکٹر صاحب کی اس "مرصع غزل" کا مقطع ملاحظہ فرمائیے جس کے لئے انھوں نے اس قدر طولانی تمہید باندھی ہے فرماتے ہیں۔

> مقام شکر ہے کہ..... جو لوگ ہندوستان سے پاکستان چلے گئے تھے یا پاکستان سے ہندوستان کی طرف آ گئے تھے انھوں نے اب محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ تقسیم ہند ایک فاش غلطی تھی اور جب بھی وہ ویزے کراتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے وطن کی طرف آ رہے ہیں۔ میں نے گاندھی جی سے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا اور وہ میرے اس خیال سے متفق تھے کہ کچھ عرصہ کے بعد حالات ضرور پلٹا کھائیں گے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

> پاکستان کے باشندوں نے اب ضرور محسوس کرنا شروع کر دیا ہوگا کہ ملک کی تقسیم فی الواقعہ غلطی تھی۔

وہ اپنے مقالہ کے آخری پیراگراف میں لکھتے ہیں۔

> خود فطرت کا فیصلہ ہے کہ اس برصغیر کے دونوں حصے ایک جغرافیائی وحدت رہیں گے۔ اور تاریخ کا سبق دونوں ملکوں کے باشندوں کو اس حقیقت کے احساس پر آمادہ کر رہا ہے کہ وہ اس کی متحدہ انفرادیت کو برقرار رکھیں۔ اس لئے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ جب بھی کوئی ملک حصوں میں بٹ گیا ہے اس کی آزادی ختم ہو گئی ہے اور وہ بیرونی تغلب کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

ہم اپنے اس "ناصح مشفق" کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان اگر تحریک پاکستان کے دوران اپنے مطالبہ پر اس لئے جمے

ہوئے تھے کہ ان کے نزدیک وہ مطالبہ خود اسلام کا تقاضا تھا تو تقسیم ہند کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر بیت رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے وہ بحضور رب العزت قدم قدم پر سجدہ کناں ہیں کہ اس نے انھیں اس ذلت و خواری کی زندگی سے نجات دلا کر آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیا ہے اس لئے آپ اس فریبِ نفس میں مبتلا نہ رہیں کہ پاکستان کے مسلمانوں نے اسے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ تقسیم ہند واقعی ایک غلطی تھی۔

اس کے بعد ہم ہندوستان کے ارباب بست و کشاد کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ حضرات متحدہ قومیت کے حامیوں کے دھوکے میں رہ کر دونوں ملکوں کے لئے کافی تباہیوں کا موجب بن چکے ہیں۔ اگر آپ مزید تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ حقائق کا بنظرِ خویش مطالعہ اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ وہ حقائق یہ ہیں کہ

(۱) پاکستان کا مطالبہ کوئی سیاسی ہتھکنڈہ نہیں تھا۔ یہ اسلام کی اس بنیادی حقیقت پر مبنی تھا کہ قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ دین کا اشتراک ہے۔

(۲) اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جو صرف ایک آزاد مملکت میں زندہ حقیقت بن کر سامنے آسکتا ہے۔ مملکتِ پاکستان کا وجود اس حقیقت کا مظہر ہے اس لئے مسلمانوں کا کسی ایسی مملکت میں رہنا جس میں وہ اپنا (قرآنی) نظامِ زندگی متشکل نہ کر سکیں کسی صورت میں آزادی کی زندگی نہیں کہلا سکتا۔

(۳) اسلام امن و سلامتی کا دین ہے، اس لئے اس دین کے پیرو دنیا میں امن قائم کرنے کے ضامن ہیں نہ کہ بدامنی پھیلانے کے۔ لہٰذا مملکتِ پاکستان تمام اقوام سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کی آرزومند ہے لیکن اگر (خدانخواستہ) ایسا وقت آجائے کہ اس کی آزادی اور آبرومندانہ حیثیت معرضِ خطر میں ہو، تو مسلمانانِ پاکستان اس خطۂ زمین کے تحفظ کو اپنا قومی فریضہ نہیں بلکہ دینی فریضہ سمجھتے ہوئے اس مقصدِ بلند کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔

(۴) ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات دو برابر کی آزاد مملکتوں کے باہمی معاہدات کی رُو سے استوار ہوں گے نہ کہ بھائی بھائی کی سطحی جذباتی اور پرفریب اپیلوں سے۔ اس باب میں ہم نہایت واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ تقسیم سے لے کر اس وقت تک ہندوستان کی طرف سے پاکستان کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوتا رہا ہے اہلِ پاکستان کے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہے۔ یہ اثر اسی صورت میں زائل ہو سکتا ہے کہ ہندوستان آئندہ اپنے رویہ میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرے۔ ہم احسان نہیں چاہتے صرف عدل چاہتے ہیں۔

---

(۲)

سابقہ ماہ کے اعلانات میں ہم نے تفصیل سے لکھا تھا کہ قوم کے مستقبل کے لئے صحیح تعلیم کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ ستمبر میں کالجوں میں نئے داخلے شروع ہوئے تو معلوم ہوا کہ صرف لاہور میں پچاس فیصد یعنی قریب تین ہزار طالب العلم ایسے ہیں جنہیں باوجود کوشش بسیار کسی کالج میں داخلہ نہیں مل سکا۔ یہ تعداد صرف لاہور کی ہے۔ سارے ملک میں کس قدر طالب علم محض داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے تعلیم سے

محروم رہ گئے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یعنی ہم تو اس بات کا رونا روتے تھے کہ ملک میں صحیح تعلیم کا فقدان ہے حالانکہ یہ بتایا گیا کہ صحیح تعلیم تو ایک طرف، ہزارہا ایسے طالب علم بجز تعلیم ہی سے محروم رہ جاتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جن کے والدین یا سرپرست تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ نوجوان، زندگی میں کیا کریں گے۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پچھلے سال جو تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تھا اگرچہ اس کی سفارشات ہمارے نقطۂ نگاہ سے چنداں حوصلہ افزا، اور اطمینان بخش نہیں تھیں۔ لیکن بہرحال، ان سے تعلیم کے سلسلہ میں کچھ حرکت پیدا ہونے کا امکان تھا۔ سنا تھا کہ ان سفارشات پر بڑی محنت سے غور و خوض ہو رہا ہے اور ان پر بہت جلد عملدرآمد شروع ہو جائے گا۔ لیکن ابھی تک اس ضمن میں کوئی عملی اقدام سامنے نہیں آیا۔ ہم متعلقہ ارباب حل و عقد سے گذارش کریں گے کہ وہ ملک کے تمام ترقیاتی مسائل میں، تعلیم کے مسئلہ کو سرفہرست رکھیں اور اس میں ذرا سے تغافل یا تساہل کو بار نہ ہونے دیں۔ ہم نے گذشتہ بیرہ سال میں اس اہم مسئلہ سے جس قدر مجرمانہ اغماض برتا ہے اس نے ہمیں معلوم مصاف زندگی میں کتنا پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اگر اس میں اسی طرح اور اضافہ ہوتا رہا تو ہمیں خطرہ ہے کہ ہم کبھی زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکیں گے۔ آج اقوام عالم جس برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہیں، جو قوم پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے بھی رک جائے، زمانہ کا ریلا اسے روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ ان حالات میں، تعلیم کے مسئلہ میں غفلت شعاری یا سست روی جن تباہ کن نتائج کی حامل ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔

جیسا کہ ہم شروع سے لکھتے چلے آ رہے ہیں، اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔ تعلیم کا سوال ان میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کا جسم اگر اشیائے خورد و نوش سے پرورش پاتا ہے تو اس کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں صحیح تعلیم و تربیت سے بارآور ہوتی ہیں۔ اشیائے خورد و نوش کی کمی سے افراد مرجھا جاتے ہیں لیکن صحیح تعلیم کے فقدان سے ساری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کے حل کے لئے از بس ضروری ہے کہ تعلیم کے لئے پانچ یا دس سالہ منصوبہ (PLAN) بنایا جائے جس کا مطمح نگاہ یہ ہو کہ ملک میں کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے۔ اور تعلیم کی پوری عمارت قرآنی خطوط پر متشکل ہو جائے جس میں انسان ایک طرف فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اپنی ذات کی تعمیر سے "اقطار السموٰت والارض" سے آگے جانے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔

---

(۳)

للہ الحمد کہ ادارہ کی مایہ ناز پیشکش "لغات القرآن" کی دوسری جلد طباعت کے آخری مراحل میں سے گذر رہی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ وسط اکتوبر تک شائع ہو جائے گی۔ اردو تو ایک طرف، قرآنی حقائق و الفاظ کی تحقیق و تشریح سے متعلق اس انداز کی کتاب کسی زبان میں بھی موجود نہیں۔ یہ مؤلف کے عمر بھر کے تدبر فی القرآن کا نچوڑ ہے۔ پرویز صاحب اکثر کہا

کرتے ہیں کہ اگر میری اور کوئی کتاب باقی نہ رہے اور صرف لغات القرآن (اور اس کے بعد آنے والی کتاب مفہوم القرآن) باقی رہ جائیں تو میں نے فہم قرآن کے عام کرنے میں جو سعی و کاوش کی ہے، اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ گویا یہ دونوں کتابیں اس قدر جامع ہیں کہ ان کے خیال میں ان کی موجودگی میں کسی اور کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ جلد دوم قریب ساڑھے پانسو صفحات پر مشتمل ہوگی اور اس میں ح سے ش تک کے الفاظ آجائیں گے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ لغات القرآن محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری نہیں۔ یہ قرآنی تصورات اور حقائق کا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں دین کے اہم گوشوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ جلد دوم میں جو اہم مباحث آگئے ہیں ان کا تعارف، زیر نظر اشاعت کے صفحات ۲۱-۲۰ پر ملاحظہ فرمائیے۔ ہمارا دور اس لحاظ سے فی الواقعہ بڑا مسعود و مبارک ہے کہ اس میں قرآن کریم سے متعلق اس قسم کا تحقیقاتی کام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ پرویز صاحب کی عمر اور صحت میں برکت عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے پیش نظر پروگرام کو بطریق احسن سرانجام دے سکیں ـــــ یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است۔

پیشگی خریدار متوجہ ہوں

"سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد بھی شائع ہوگئی ہے۔ یہ کتاب ۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت چھ روپے ہے۔ آپ میں سے جو صاحب کتاب نہ منگانا چاہیں وہ براہ کرم دس اکتوبر تک اطلاع بھیجدیں اگر اس تاریخ تک اطلاع موصول نہ ہوئی تو کتاب بذریعہ ڈاک بھیجدی جائے گی۔ اور قیمت کھاتے سے وضع کرلی جائے گی۔

مکتبہ طلوع اسلام
۲۷-بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

پیشگی خریداران سے ایک گذارش

جو ہمارے کرمفرما احباب پیشگی خریدار ہیں اور وہ کراچی سے منتقل ہو کر راولپنڈی تشریف لے آئے ہیں ازراہ کرم وہ احباب اپنے نئے پتہ سے مکتبہ کو مطلع فرمادیں۔ تاکہ رجسٹر میں درستی کرلی جائے۔

ـــــ منیجر مکتبہ طلوع اسلام
۲۷-بی۔ شاہ عالم مارکیٹ ـــــ لاہور

محمدؐ کی کہانی۔ خدا کی زبانی

(پرویز)

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

(امسال عید میلادالنبیؐ کی تقریب پر پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا موضوع تھا۔

"محمدؐ کی کہانی ـــــ خدا کی زبانی"

اس درس کو انھوں نے قارئینِ طلوعِ اسلام کے افادہ کی غرض سے مقالہ کی شکل میں منضبط کر دیا ہے جسے بمسرت درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔　　طلوعِ اسلام)

خدا نے مخلوق کو پیدا کیا تو اس کی پرورش کا ذمہ بھی خود ہی لیا۔ اسے خدا کی ربوبیت کہتے ہیں۔ حیوانات تک پرورش محض طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کی ہوتی ہے۔ اس کے لئے خدا نے صفحۂ ارض پر سامانِ رزق کو پھیلا دیا۔ اور ساتھ ہی ہر نوع (SPECIES) کو وہ ہدایات (DIRECTIONS) دیدیں جن کے مطابق وہ سامانِ رزق سے مستفید ہو سکتی ہے۔ یہ ہدایات ہر نوع کے ہر فرد کے اندر پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی جاتی ہے۔ انھیں جبلّت (INSTINCT) کہتے ہیں۔ یہی وہ جبلّت ہے جس کی رُو سے (مثلاً) بطخ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کی طرف لپکتا ہے اور مرغی کا چوزہ خشکی کی طرف دوڑتا ہے۔ بکری گھاس کھاتی ہے، گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی اور شیر گوشت کھاتا ہے، گھاس کی طرف تکتا نہیں خواہ وہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے۔

انسانی ہدایت کا سرچشمہ

انسان کو دُہری زندگی ملی ہے۔ ایک تو وہی جبلی زندگی (اس کے جسم کی زندگی) جو ہر حیوان کو ملی ہے۔ اور دوسری "انسانی زندگی" جو کسی حیوان کو نہیں ملی۔ جہاں تک اس کی طبعی زندگی کا تعلق ہے، انسانی بچے کو بھی اس امر کی ہدایت پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتی ہے کہ وہ بھوک کے وقت کس طرح اپنے رزق (دودھ) کے چشموں سے فائدہ اٹھائے۔ اس چیز کے لئے اسے کسی خارجی ہدایت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں تک اس کی "انسانی زندگی" کا تعلق ہے، اس کے لئے انسان کے اندر کوئی ہدایت نہیں ہوتی۔ یہ ہدایت اسے خارج سے ملتی ہے۔ اس ہدایت کا طریق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص انسان کو یہ ہدایت بذریعہ وحی عطا کرتا تھا (اسے خدا کا نبی یا رسول کہتے ہیں) اور وہ اس ہدایت کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ انسانوں کے لئے اس طریق ہدایت کو اختیار کرنے میں ایک خاص مصلحت تھی۔ جو ہدایت کسی کے اندر پیدائشی طور پر رکھ دی جاتی ہے، وہ اس ہدایت کے مطابق چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بکری گھاس کھانے پر اور مچھلی پانی میں تیرنے پر مجبور ہے۔ وہ اس کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔

لیکن انسان کو خدا نے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس سے یہ حیوانات سے ممتاز ہے۔ اگر یہ ہدایت اس کے اندر رکھ دی جاتی تو یہ بھی (حیوانات) کی طرح اس پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا اور اس طرح اس کا اختیار و ارادہ باقی نہ رہتا۔ یعنی یہ بھی حیوانات کی سطح پر آجاتا۔ اس لئے اس کی صورت میں، خدا نے یہ کیا کہ اس کی طرف ہدایت (بذریعہ انبیاء کرام) خارج سے بھیجی اور اس سے کہہ دیا کہ یہ چاہے تو اسے اختیار کرلے اور چاہے اس سے انکار کردے۔ اگر یہ اسے اختیار کرے گا تو اس کے شرفِ انسانیت کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی۔ اگر یہ اس سے انکار کردے گا تو حیوانی سطح پر رہ جائے گا اور اس کی زندگی جہنمی ہو جائے گی۔

آخری ہدایت

جن حضرات (انبیاء کرام) کی وساطت سے خدا کی ہدایت دوسرے انسانوں تک پہنچی تھی وہ پہلے خود اس ہدایت پر عمل کرتے تھے اور ان کا عمل دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتا تھا۔ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت نوح سے شروع ہوا اور نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ پر جاکر ختم ہوگیا[1]۔ یعنی خدا نے جو ہدایت نوعِ انسانی کو دی تھی وہ قرآن کریم میں تکمیل تک پہنچ گئی جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا۔ اس لئے اس کے بعد کسی مزید آسمانی ہدایت کی ضرورت نہ رہی۔ اور جب کسی مزید ہدایت کی ضرورت نہ رہی تو کسی ہدایت لانے والے (نبی یا رسول) کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور نبی اکرم خدا کے آخری نبی ہیں۔

قرآن کریم نے جہاں یہ بتایا ہے کہ جو ہدایت اس میں دی گئی ہے اصولی طور پر وہی ہدایت پہلے انبیائے کرام کو بھی دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سابقہ انبیائے کرام کے زندگی کے احوال و کوائف بیان کرکے یہ بتایا ہے کہ انہوں نے اس ہدایت کو کس طرح

---

[1] قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آسمانی ہدایت کا یہ سلسلہ تمام اقوامِ عالم میں جاری رہا تھا اور کوئی بستی ایسی نہیں گذری جس میں خدا کا رسول نہ آیا ہو لیکن اس نے تفصیلی طور پر صرف سامی اقوام کے انبیائے کرام ہی کا ذکر کیا ہے کیونکہ قرآن کریم کی اولیں مخاطب قوم ان انبیاء کرام سے واقف تھی اور وہ خود بھی سامی قوم سے تھی۔

پیش کیا۔ اس پر کس طرح عمل کر کے دکھایا۔ اور ان کی قوم کی طرف سے ان کی دعوت کا کیا جواب ملا۔ جس طرح اُس نے انبیائے سابقہ کے متعلق یہ کچھ بتایا ہے اسی طرح اُس نے خود نبی آخر الزماں (ﷺ) کے متعلق بھی یہ کچھ بیان کیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ کچھ اس شرح و بسط سے بیان ہوا ہے کہ ان درخشندہ موتیوں کو ایک لڑی میں پرو لیا جائے تو اس سے سیرتِ نبی اکرمؐ کی سلکِ گہردار نہایت آب و تاب سے مرتب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

قرآنی سیرت

میں نے اپنی کتاب (معراج انسانیت) میں جو بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے حضورؐ کی سیرت کو قرآنی آیات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ ذیل کی سطور میں اسی تفصیل کو سمٹی ہوئی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اپنی اس کوششِ ناتمام کو عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر تحفتہً پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں[1]۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ آسان زبان میں پیش کیا جائے کیونکہ احباب کا تقاضا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی خط و خال سلیس زبان میں سامنے لانے چاہئیں تاکہ اس سے ہمارا کم تعلیم یافتہ طبقہ بھی مستفید ہو سکے۔

نبوت کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسان اپنے کسب و ہنر سے محنت کر کے حاصل کر لے۔ یہ خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی جسے یہ خصوصیت عطا کی جانی مقصود ہوتی تھی اس کی شروع سے تربیت خود اللہ تعالیٰ کی زیرِ نگرانی ہوتی تھی۔ اس شخص کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا تھا کہ اسے نبوت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے زمانے کی غلط باتوں سے متنفر ہو جاتا تھا۔

تلاشِ حقیقت میں سرگرداں

اُسے حقیقت کا علم تو نہیں ہوتا تھا لیکن باطل کی باتوں میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا تھا۔ یہی وہ کیفیت ہے جس سے قرآن کریم نے سب سے پہلے نبی اکرمؐ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷)

ہم نے تجھے (تلاشِ حقیقت میں) سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ سرزمین حجاز کا سب سے بڑا اور مشہور شہر مکہ، اپنی تمام جاذبیتوں کے ساتھ، وہاں کے باشندوں اور باہر والوں کے لئے مرکزِ توجہ بن رہا ہے۔ اس توجہ کی بنیادی وجہ خانہ کعبہ ہے جس کا حقیقی مقصد تو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے لیکن اس کی عقیدت لوگوں کو دور دور سے اس کی طرف کھینچے لئے آتی ہے۔ یہ لوگ فرطِ عقیدت میں اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ کوئی تالیاں پیٹتا ہے۔ کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی جذب و کیف کے عالم میں اس کے گرد گھومتا ہے کوئی ناچتا ہے کوئی کودتا ہے۔ کوئی بتوں کے استھانوں پر جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زمزم کے کنارے بیٹھا مصروف

---

[1] یہ مقالہ اس درس پر مبنی ہے جو اسال بتقریب عید میلاد النبیؐ دیا گیا تھا۔

بادہ پرستی ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو ان سے اپنے فسانۂ عشق و محبت کا انجام معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ ادھر عکاظ کے بازار میں شعر کے جادو بیان اپنی سحر آفرینیوں سے سننے والوں کی ناک میں نکیل ڈالے جس وادی میں چاہے لئے لئے پھرتے ہیں۔ وہ کسی کے دل میں افسونِ محبت پھونکتے ہیں اور کہیں آتشِ انتقام کے شعلے بلند کرتے ہیں۔

لیکن مکہ کی انہی گلیوں میں ایک ایسا شخص بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا نظر نہیں آتا۔ اسے نہ حریمِ کعبہ کی ان ہنگامہ آرائیوں میں کوئی جاذبیت دکھائی دیتی ہے نہ عکاظ کی رستاخیزیوں میں کوئی کشش۔ وہ ان پڑھ ہے لیکن عیسائی راہبوں اور یہودی عالموں کے پاس جاتا ہے کہ شاید انہی سے حقیقت کا سراغ مل جائے۔ وہ وہاں سے دل برداشتہ اٹھتا ہے تو صحرا کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے اور کائنات کی نیرنگیوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کی ہر مجلس میں جاتا اور کائنات کے ہر گوشے میں گھومتا ہے کہ کہیں سے اسے وہ شے مل جائے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے۔ لیکن ہر مقام سے یہ کہتا ہوا ناکام لوٹتا ہے کہ

عروسِ حقیقت کی بے نقابی

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

وہ اسی طرح مضطرب و بے قرار پھرتا ہے کہ ایک شب لیلائے حقیقت یک بیک اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے اور اپنے حسین چہرے سے یوں نقاب اٹھاتی ہے کہ اس کے تبسم سے کائنات جگمگا اٹھتی ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا (۱) اور ایسی مبارک رات جس میں خدا کی حکمتِ بالغہ سے حق و باطل نکھر کر الگ الگ ہو گئے، اور نوعِ انسانی کو زندگی کی نئی اقدار مل گئیں۔ (۲)

یوں خدا کی وحی اس پر نازل ہوئی۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے!

عطائے وحی

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (۴۲/۵۲)

نہ وہ جانتا تھا اور نہ ہی اسے اس کی کوئی توقع تھی۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (۲۸/۸۶) وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ..... (۴/۱۱۳)

یوں اس متلاشیٔ حقیقت کو نبوت عطا ہو گئی اور اسے وہ وہ کچھ سکھا دیا گیا جسے وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔

۱۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵)

۲۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۔ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (۴۴/۳-۴) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷/۱)

بہ حالِ نبوت یتیم بھی تھا اور غریب بھی۔ (اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۔۔۔۔ وَوَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰی ۔۔۔۔ ۹۳/۶-۸)۔ نیز نبوت سے پہلے اَن پڑھ بھی۔ (وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ ۔۔۔۔ ۲۹/۴۸)۔

یوں اس بے یار و مددگار، یتیم، غریب اور نادار، اَن پڑھ صحرانشین کو تمام عالمِ انسانیت کا سب سے بڑا معلم بننے کے لئے منتخب کیا گیا۔

---

(۳)

عام طور پر خیال یہ کیا جائے گا کہ جب اس شخص نے وہ کچھ پا لیا جس کی اسے تلاش تھی تو پھر وہ زندگی کے باقی دن آرام اور سکون سے بیٹھ رہا ہوگا۔ اس لئے کہ جب مقصد حاصل ہو جائے تو پھر جد و جہد ختم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر تو یہی ہوتا ہے لیکن نبی کی کیفیت عام لوگوں سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اسے نبوت تو بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے لیکن اس پر ذمہ داریاں اس قدر عائد کی جاتی

نبوت کی ذمہ داریاں

ہیں جن سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے (وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ ۹۴/۲-۳)۔ چنانچہ منصبِ نبوت پر سرفراز کئے جانے کے بعد، نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ اے وہ کہ جس کے ذمے نظامِ عالم کو درست کرنا ہے۔ قُمْ۔ اٹھ۔ فَاَنْذِرْ۔ اور لوگوں کو غلط نظامِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۱-۳) اور ساری دنیا میں اعلان کر دے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ظاہر ہے کہ جس دعوت سے مراد یہ ہو کہ انسانوں کے نظامِ کہن کی بساط الٹ کر اس کی جگہ ایک جدید نظام قائم کیا جائے، اس دعوت کی مخالفت ہر طرف سے ہوگی۔

دنیا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص غیروں کی مخالفت مول لیتا ہے وہ اپنوں کو اپنے ساتھ ضرور رکھتا ہے۔ اس کا اپنا قبیلہ اور خاندان ہوتا ہے جو دوسروں کی مخالفت میں اس کا پشت و پناہ بنتا ہے۔ وہ انہی کی مدد اور حمایت کے بھروسہ پر دوسروں کے خلاف اٹھتا ہے۔ لیکن آسمانی انقلاب کے داعی کا انداز اس باب میں بھی دنیا جہان سے نرالا ہوتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز ہی اپنے خاندان اور قبیلے سے کرو۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (۲۶/۲۱۴)

سلسلۂ دعوت

اے رسول! اپنے قریبی رشتہ داروں کو، ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرو۔ اس کے بعد مکے بھر اور سارے اہلِ مکہ اور اس کے گرد و نواح کی آبادیوں تک اس دعوت کو پہنچاؤ (وَكَذٰلِكَ

اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا..... (۴۲/۷) اس کے بعد اس سلسلہ کو اور وسیع کرو اور پوری کی پوری عرب قوم کو اس کے دامن تلے لے آؤ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ..... (۱۳/۳۰)

اور اسی طرح ہم نے تجھے ایک ایسی قوم کی طرف بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں ہو گذری ہیں۔ (بھیجا اس لئے ہے) تاکہ جو بات تجھ پر وحی کی گئی ہے تو اسے ان کے سامنے پیش کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدائے رحمٰن کا انکار کرتے ہیں (تو انہیں اس پر ایمان کی دعوت دے)۔

اور اس کے بعد اس سلسلے کو ایسا حدود فراموش کر دے کہ یہ تمام نوع انسانی کو اپنے آغوش میں لے آئے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا..... (۷/۱۵۸)

تو عالم انسانیت کو پکار کر کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

یہ تھیں وہ عظیم ذمہ داریاں جو نبوت عطا ہونے پر اس ذات گرامی پر عائد کی گئیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ دعوت کیا تھی جسے اس طرح عام کرنے کے لئے اس قدر تاکید کی جا رہی تھی؟

یہ دعوت کیا تھی؟ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں تھی۔ یہ وہی دعوت تھی جو ہر آسمانی انقلاب لانے والے (نبی) کے ذریعے انسانوں تک پہنچائی گئی تھی۔ یعنی لِقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹)۔ حاکمیت صرف خدا کے قوانین کی اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ یعنی

لا الٰہ الا اللہ

دیکھنے میں تو یہ چار لفظ ہیں لیکن ان میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)۔ خدا کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔ دنیا میں اقتدار صرف قوانین خداوندی کا ہو اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار و اختیار نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دعوت تھی محکوموں کو حاکموں کے استبداد سے نجات دلانے کی۔ یہ دعوت تھی مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے رہائی دلانے کی۔ یہ دعوت تھی ان زنجیروں کو توڑنے کی جن میں ناتواں انسانیت جکڑے چلی آ رہی تھی۔ اور اس کے سر سے اس بوجھ کو اتارنے کی جس کے نیچے وہ بری طرح کچلی جا رہی تھی۔ (وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ ۷/۱۵۷)۔

اعلانِ جنگ اور دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ دعوت دنیا کے ہر صاحب اقتدار و ذی اختیار کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اس لئے ان کا اس دعوت کے خلاف محاذ بنا کر اٹھ کھڑے ہونا بالکل فطری تھا۔ اس میں ایک طرف ارباب حکومت تھے تو دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے علمبردار۔ دائیں کو سرمایہ داروں کا گروہ تھا تو بائیں کو فریب کاروں کا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ..... (۲۵/۳۱) اور اس طرح انسانیت کی عدالت کے مجرمین آسمانی دعوت لانے والے نبی کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ یہ سرکشی اور مخالفت اس لئے ہوتی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے پاس بڑی دولت ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بھاری ہے اس لئے ہم پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے؟ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۴/۳۵) قرآن انہیں مترفین کا گروہ کہہ کر پکارتا ہے یعنی وہ تن آسان جو دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ آسمانی انقلاب کی دعوت جب اور جہاں بھی بلند ہوئی، اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔

مخالفت وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴)۔ "ہم نے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا کہ وہاں کے تن آسان، خوشحال طبقہ کی طرف اس کے پیغام کی مخالفت نہ ہوئی ہو"۔ یہی وہ طبقہ تھا جس کی طرف سے نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت ہوئی۔ اسی طبقہ کا وہ نمائندہ تھا جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا۔ (۷۴/۱۲-۱۳)۔ "ہم نے اسے فراواں دولت اور کثیر بیٹے دیئے تھے جو وہاں موجود تھے"۔ وَمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (۷۴/۱۴) "اور میں نے اس کے تمام معاملات درست کر رکھے تھے۔ بڑا ساز و سامان دے رکھا تھا۔ یہی تھا جس نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۔ (۷۴/۲۴-۲۵) یعنی رسول اللہؐ کا یہ دعویٰ کہ انہیں خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے، غلط ہے یہ (معاذ اللہ) جھوٹ ہے جو یونہی چلا آرہا ہے۔ یہ صرف انسانی کلام ہے"۔ چنانچہ کبھی آپؐ کو ساحر کہا گیا اور کبھی کذاب۔ کبھی شاعر کبھی مجنون۔ وہ اس دعوت کی مخالفت دلیل و برہان کی رُو سے نہیں کر سکتے تھے، اس لئے وہ عوام کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے مسلک سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ یہی ان کی دلیل اور یہی برہان۔ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۳) اے رسول! جس طرح آج مکہ کے سردار تمہاری مخالفت میں سرگرم ہیں۔ اسی طرح تجھ سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے جس آبادی کی طرف اپنا رسول بھیجا تو وہاں کے مترفین نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم اس نئی دعوت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک روش پر چلتے دیکھا ہے۔ اور ہم انہی کے نقوشِ قدم کی پیروی کرتے چلے جائینگے لیکن انہیں اس دلیل کی کمزوری کا احساس تھا اور اس امر کا یقین کہ جس شخص نے ایک مرتبہ بھی قرآن کو توجہ سے سن لیا تو وہ ضرور اس پر ایمان لے آئے گا۔ اس لئے وہ اپنے لوگوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ

قرآن مت سنو لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱/۲۶) اس قرآن کو مت سنو۔ جہاں اس کی تعلیم دی جا رہی ہو وہاں شور مچا دو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے شاید تم اس نئی تحریک پر غالب آسکو۔

قرآن کے متعلق تو وہ یہ کہتے اور خود رسول اللہؐ کے متعلق لوگوں کو یہ کہہ کر بہکاتے کہ ذرا دیکھو تو سہی۔ یہ کیس قسم کا رسول ہے

کہ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ۔ عام لوگوں کی طرح کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ رسول کو عام انسانوں سے الگ قسم کا ہونا چاہیئے۔ اُس کے پاس مافوق الفطرت قوتیں ہونی چاہئیں۔ اگر اس پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے تو لَوْ لَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا (۲۵/۷) ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ آتا اور وہ اس کے ساتھ لوگوں کو ان کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کرتا۔ اس طرح ساری دنیا دیکھ لیتی کہ واقعی اس کی طرف فرشتے خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں؟

وہ توہم پرستی کا زمانہ تھا۔ اس لئے لوگوں کا اُن کے اس بہکاوے میں آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ لوگ حضورؐ کے پاس آتے اور آپؐ سے کہتے کہ آپؐ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے رسول ہیں؟ آپؐ اُن کی اِن باتوں کو صبر و سکون سے سنتے اور ایک تبسم جاں نواز سے ان سے کہتے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)۔ میں کہیں باہر سے نہیں آیا کہ تمہیں میرے متعلق کچھ علم نہ ہو۔ میں نے اس دعویٔ نبوت سے پہلے ایک عمر تمہیں لوگوں میں گذاری ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ کیا میری زندگی تمہیں یہی بتاتی ہے کہ میں جھوٹا اور فریب کار ہوں؟ تم ذرا عقل و فکر سے کام لو اور سوچو کہ جھوٹے کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے!

سب سے بڑا معجزہ

اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ وہ معجزہ تھا جس کے سامنے سب کی نگاہیں جھک جاتی تھیں لیکن مفاد پرست گروہ کے دل میں اس سے مخالفت کی آگ اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اب انھوں نے الزام تراشی اور تہمت بافی سے آگے بڑھ کر دست درازی بھی شروع کر دی۔ قرآن کریم نے اس مخالفت کی تفصیل کو چار لفظوں کے اجمال میں یوں بتا دیا ہے کہ وَ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا (۷۲/۱۹)۔ "اور جب اللہ کا یہ بندہ خدا کو پکارنے کے لئے اٹھا تو قریب تھا کہ مخالفین چاروں طرف سے یورش کر کے اس سے لپٹ جائیں۔

استقامت کی تلقین

جوں جوں اُدھر سے مخالفت کی شدت بڑھتی جاتی تھی، خدا کی طرف سے آپؐ کو استقامت اور استقلال کی تاکید زیادہ ہو جاتی تھی کبھی کہا جاتا۔ اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۳۸/۱۷) جو کچھ یہ تم سے کہتے ہیں اس پر استقلال و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (۳۰/۶۰) تم اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں مستقل مزاجی سے کام لو۔ اور اس حقیقت پر یقین رکھو کہ خدا نے تم سے جو وعدہ کر رکھا ہے کہ آخرالامر تمہارا مشن کامیاب ہو گا وہ بالکل سچا ہے۔ اور یاد رکھو۔ تم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جس کی وجہ سے تم ان مخالفین کی نظروں میں ہلکے ہو جاؤ۔ استقامت سے کام لو اور ان کی حرکات سے دل برداشتہ ہو کر اپنی اُن کوششوں میں کمی نہ ہونے دو جن سے تم ان لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتے ہو۔ وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (۶/۷۰) اور قرآن کے ذریعے لوگوں کو نصیحت کرتے رہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَ لَا

تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (۴۵/۱۸)۔ اسی طرح انھیں صحیح نظامِ زندگی کی طرف دعوت دیتا رہ اور جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے استقامت و عزیمت سے اس راہ پر جما رہ۔ اور ان مخالفین کی خواہشات کا اتباع مت کر۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ۔ وَاصْبِرْ۔ (۱۰/۱۰۹) جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے، اس کا اتباع کیے جاؤ۔ اور اپنی راہ پر استقامت سے قائم رہو۔ تم کبھی اور وہ لوگ بھی جو اپنی غلط روش کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ ہو لیے ہیں۔ فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ۔ (۱۱/۱۱۲) ثابت قدم رہو اور اپنی تگ و تاز کو تیز تر کرتے جاؤ۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا۔ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ۔ لَعَلَّكَ تَرْضٰى۔ (۲۰/۱۳۰) جو کچھ یہ تیرے خلاف کہتے (اور کرتے) ہیں، تم اس پر ہمت نہ ہارو۔ ثابت قدم رہو۔ اور اپنے نشوونما دینے والے کے پروگرام کو وجہِ محمود و ستائش بنا کر دکھانے میں پوری تگ و تاز سے کام لو۔ صبح۔ شام۔ راتوں کے اوقات میں۔ اطراف نہار میں۔ غرضیکہ دن رات اس پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ جد و جہد رہو۔ تاکہ اس طرح تم اس کے خوشگوار نتائج کو اپنے سامنے دیکھ کر خوش ہو جاؤ۔

مفاہمت کی کوشش

جب مخالفین نے دیکھا کہ اتنی شدید مخالفت کے باوجود اس جماعت کی تگ و تاز میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور یہ تحریک ہی بڑھتی جا رہی ہے۔ تو جیسا کہ بساطِ سیاست کے ہر بازوں کا قاعدہ ہے انھوں نے چاہا کہ آپ سے مفاہمت (COMPROMISE) کر لی جائے۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۶۸/۹)۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ اگر تم کچھ مداہنت برتو۔ اپنے مقام سے تھوڑا سا پھسل جاؤ۔ تو یہ بھی مداہنت سے کام لیں۔ ظاہر ہے کہ قرآنی نظام میں ان لوگوں کی مفاد پرستیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ یا تو باہمی مفاہمت سے اس نظام کی جگہ کوئی دوسرا نظام قائم کر لیا جائے یا قرآنی نظام میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جس سے ان کی مفاد پرستیوں کے لئے کچھ گنجائش نکل آئے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ۔ (۱۰/۱۵) جب ان کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کیے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس میں (ہماری حسبِ منشا) تبدیلی کر دو۔ تو پھر ہم آپ سے مصالحت کر لیں گے۔ اس "پیشکش" کے جواب میں آپ سے کہا گیا کہ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶۸/۸) ان جھٹلانے والوں کی بات ہرگز نہ ماننا۔ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا... (۱۱/۱۱۳) ان ظالمین کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ ان سے کہہ دو کہ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۱۰/۱۵) میری کیا طاقت ہے کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی رد و بدل کر سکوں۔ میرا منصب یہ ہے کہ میں اس کا اتباع کروں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کا اتباع نہ کروں۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک

سخت مصیبت کے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ـــــ یہ بات کسی ضدی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس لئے تھی کہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (۲۳/۷۱) اگر حق لوگوں کے جذبات اور خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جائے تو ارض و سموٰت اور جو کچھ ان کے اندر ہے درہم برہم ہو جائے۔ لہٰذا حق کی باطل کے ساتھ مفاہمت ہو نہیں سکتی۔ البتہ ان سے ایک بات کہی جا سکتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جس روش پر یہ چل رہے ہیں وہ خوشگواریوں اور کامیابیوں کی روش ہے۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ روش تباہیوں اور بربادیوں کی طرف لے جانے والی ہے۔ زندگی کی کامرانیوں کا ضامن وہ پروگرام ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو۔ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ. وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۱/۱۲۱) ان لوگوں سے جو تمہاری بات کا یقین نہیں کرتے یہ کہو کہ تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو اور ہمیں اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ اس کے بعد تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ حق و صداقت کی راہ کونسی ہے؟

اس کے ساتھ ان سے یہ بھی کہو کہ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ۔ میں تم سے صرف ایک بات کی نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى۔ اور وہ یہ ہے کہ تم زیادہ نہیں تو ایک ایک، دو دو کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔ اور اپنے جذبات سے الگ ہٹ کر جن میں تم اس وقت اندھا دھند بہے چلے جا رہے ہو سوچو۔ غور و فکر کرو۔ اگر تم نے خالی الذہن ہو کر سوچنے کی کوشش کی تو تم خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاؤ گے کہ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۳۴/۴۶)۔ تمہارا یہ ساتھی پاگل نہیں ہے۔ یہ جو کچھ کہتا ہے بڑی سمجھ بوجھ کی بات کہتا ہے۔ اس کے ماننے میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ مَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (۳۴/۴۷) میں تو تم سے اس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگتا۔

سوچو

اس سے بہت سے سعادت مند افراد نے رفتہ رفتہ ادھر آنا شروع کر دیا۔ اور اس جماعت میں ترقی ہونی شروع ہو گئی ان کے سامنے بہت بڑا پروگرام تھا۔ غلط معاشرہ کی جگہ ایک جدید معاشرہ کا قیام جس میں مفاد پرستوں کی ہوس رانیوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ کوئی چھوٹا کام نہ تھا۔ قدوسیوں کا یہ مختصر سا گروہ، دن رات اسی فکر میں غلطاں و پیچاں اور اسی مقصد کے حصول کے لئے جنباں و کوشاں رہتا تھا۔ اس باب میں ان کی شدتِ شوق خود فراموشی تک پہنچ جاتی تھی جسے روکنے کے لئے خود دستِ قدرت کو اس قافلۂ رشد و ہدایت کے ہادیٔ خوان کی دامن کشی یہ کہہ کر کرنی پڑی تھی کہ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا. نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا (۷۳/۱-۳)۔ راتوں کو تھوڑا جاگا کرو۔ نصف شب تک یا اس سے کم و بیش۔ اس لئے کہ ابھی تو آغاز سفر ہے۔ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا۔ (۷۳/۵)۔ تجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی جانے والی ہے۔ اور اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (۷۳/۷) تجھے دن کو کونسا آرام کا وقت مل جاتا ہے۔ اس میں بھی تمہارا پروگرام لمبا

دن رات کا پروگرام

چوڑا ہوتا ہے۔

جوں جوں یہ پروگرام قرآن ہوتا جارہا تھا، مخالفین کی ایذا رسانیاں شدید تر ہوتی جارہی تھیں، عام لوگوں کو مخالفین پر غصہ آتا ہے اور ان کے خلاف آتشِ انتقام تیز ہوتی جاتی ہے۔ لیکن نبی کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جس طرح ایک طبیبِ مشفق کو، نادان مریض کی بے احتیاطی اور بدپرہیزی سے دکھ ہوتا ہے، اسی طرح ان مخالفین کی ضد اور ہٹ دھرمی پر نبی اکرمؐ کا جی کڑھتا تھا اور اس تصور سے آپؐ کا دل خون ہوجاتا تھا کہ یہ نادان محض تعصب اور جہالت کی وجہ

مخالفین سے ہمدردی

سے کس طرح اپنے آپ کو تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لئے جارہے ہیں۔ حضورؐ کی شدتِ احساس کی یہ کیفیت تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا پڑا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۲۶/۳) ایسا نظر آتا ہے کہ تم اس غم میں کہ یہ لوگ حق و صداقت کی راہ کو تسلیم کیوں نہیں کرتے، اپنی جان ہلاک کر لوگے۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵/۸) ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کی حالت پر غم کھانے سے تم اپنی جان گنوا بیٹھو۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (۴۲/۴۸) اگر یہ لوگ اس راہ سے اعراض برتتے ہیں تو ہم نے تمہیں ان کا محافظ بنا کر نہیں بھیجا۔ تمہارے ذمے بس اتنا ہی ہے کہ تم اس پیغام کو ان تک پہنچا دو۔ ہم نے انہیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور اپنا راستہ آپ اختیار کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ ماننا نہ ماننا ان کا اپنا کام ہے۔ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸/۲۱-۲۲)۔ تم انہیں حقیقت کی یاددہانی کرتے رہو۔ تمہارا فریضہ یاددہانی کرانا ہے۔ تم ان پر داروغہ نہیں مقرر کئے گئے۔

یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ وہ وقت آپہنچا جب دیکھ لیا گیا کہ ان میں سے جن لوگوں نے عقل و فکر اور دلیل و برہان کی رو سے صحیح راستہ اختیار کرنا تھا وہ اس جماعت میں شامل ہوگئے ہیں اور باقی وہ رہ گئے ہیں جن پر پند و نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔

اعراض

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۲/۶) انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے ان کے لئے یکساں ہے۔ جو شخص خودکشی کرنے پر تُلا بیٹھا ہو، اس سے یہ کہنا کہ دیکھنا راستے میں کھائی ہے، بےکار ہے۔ جو شخص حیوانی سطحِ زندگی (PHYSICAL LIFE) ہی کو زندگی سمجھتا ہے اور انسانی زندگی کو تسلیم نہیں کرتا، اور باوجود ہر طرح سمجھانے کے لئے اپنی ضد نہیں چھوڑتا، اسے انسانی سطحِ زندگی کے اصول و قوانین کی تلقین کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ لہٰذا اس مقام پر حضورؐ سے کہا گیا کہ فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (۵۳/۲۹)۔ سو جو شخص ہمارے قوانین سے روگردانی کرتا ہے اور طبعی زندگی کے علاوہ اور کچھ ارادہ ہی نہیں رکھتا اس سے تم اعراض برتو۔ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ (۴۳/۸۹)۔ ان سے الگ ہوجاؤ اور کہہ دو کہ میرا اب سلام ہے۔ عنقریب انہیں معلوم ہوجائے گا کہ جو کچھ تم کہتے تھے وہ کس طرح حرفاً حرفاً ٹھیک تھا۔

لیکن ان مخالفین کا جوشِ انتقام اس کے باوجود ٹھنڈا نہ ہوا اور وہ حضورؐ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرنے لگے۔ وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۸/۳۰)۔

حضورؐ کے خلاف سازشیں

"اور اے رسولؐ! وہ وقت یاد کرو جب مخالفین تیرے خلاف اپنی خفیہ تدبیروں میں لگے ہوئے تھے تاکہ تجھے گرفتار کرلیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے تھے اور خدا اپنی تدبیر کر رہا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

ہجرت

چنانچہ اس تدبیر کے مطابق حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی جہاں کی فضا کے متعلق علم تھا کہ وہ نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ ہجرت سے یہی مقصود ہوتا ہے۔ اسی لئے مکہ چھوڑتے وقت حضورؐ کے لب پر یہ دعائیں تھیں کہ وَقُل رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا (۱۷/۸۰)۔ "اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے جہاں کہیں پہنچا سچائی کے ساتھ پہنچا اور جہاں سے نکال سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے ہاں سے ایسی قوت عطا فرما جو ہر حال میں مدد کرنے والی ہو۔"

آپؐ اس حالت میں مکہ سے نکلے کہ صرف ایک رفیق ہمراہ تھا۔ لیکن اس (بظاہر) بیکسی اور بےبسی کے عالم میں بھی اپنے مشن کی صداقت اور کامیابی پر ایسا یقینِ محکم تھا کہ اپنے ساتھی کو تلقین فرما رہے تھے کہ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (۹/۴۰)۔ "مت گھبراؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

مدینہ کے مسلمانوں نے مکہ سے آنے والے مسلمانوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ اور یوں ایک ایسی برادری کا وجود عمل میں آیا جو خون، رنگ، وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر محض آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہوئی تھی اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تصدیق عطا ہوئی کہ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۲)۔ "جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی۔ تو یہی لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔"

ایک نئی برادری

اب (بظاہر) مخالفین کی مخالفت ختم ہو جانی چاہیئے تھی لیکن انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ نظام جس کی طرف نبی اکرمؐ دعوت دیتے تھے کسی ایک مقام میں بھی متشکل ہو گیا تو اس کے حیات بخش نتائج کو دیکھ کر دوسرے مقامات کے لوگ اس کی طرف لپک کر بڑھیں گے اور یوں ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے اس جماعت کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور لڑائی کے لئے آمادہ آئے۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ میدانِ جنگ میں کیا جائے۔ چنانچہ اس مختصر سی جماعت کو جنگ کی

جنگ کی اجازت اجازت دی گئی۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ۔ ان مظلوموں کو (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے جن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے دشمن امڈے آ رہے ہیں۔ اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ نِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ انھیں جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا۔ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ (جو لوگ دوسروں پر زیادتی کرنے کی غرض سے چڑھ دوڑتے ہیں) ان کی مدافعت دوسرے انسان کریں، تو اس دھاندلی کا نتیجہ یہ ہو کہ دنیا میں مذہب کی آزادی ختم ہو جائے اور نہ راہبوں کی کوٹھڑیاں باقی رہیں نہ عیسائیوں کے گرجے۔ نہ یہودیوں کے معبد سلامت رہیں نہ مسجدیں جن میں خدا کا ذکر اس کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کا پروگرام وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ سو جو شخص اس پروگرام کی تکمیل میں خدا کی مدد کرے گا، خدا اس کی ضرور مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا طاقتور اور غالب ہے ——— اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ مظلوم جنھیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ اگر غالب آ گئے اور انھوں نے اپنی حکومت قائم کر لی، تو ان کی حکومت دوسرے ارباب

اسلامی مملکت کا مقصد اقتدار سے کس طرح مختلف ہوگی۔ فرمایا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۳۹-۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کریں گے۔ نوعِ انسان کی پرورش کا انتظام کریں گے۔ لوگوں کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم دیں گے اور غیر خداوندی قوانین کی اطاعت سے روکیں گے۔ غرضیکہ اس طرح تمام امور آخر الامر خدا کے پروگرام کے مطابق طے پائیں گے۔

اس مقصد کے لئے انھیں جنگ کی اجازت دی گئی۔ دونوں جماعتوں کا آمنا سامنا بدر کے مقام پر ہوا (۳/۱۲۲)۔ مسلمانوں کے لشکر کی کمان خود نبی اکرمؐ کر رہے تھے۔ مخالفین کو شکست ہوئی اور مظلومین کی یہ جماعت جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ پہلے اپنے گھروں سے نکالی گئی تھی، فاتح و منصور واپس لوٹی۔

شکست خوردہ مخالفین نے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ ان بے گناہ مسلمانوں سے لینا شروع کر دیا جو مکہ میں رہ گئے تھے اور ہجرت کر کے مدینہ نہیں جانے پائے تھے۔ یہ مظلوم اپنی مدد کے لئے مدینہ کے مسلمانوں کے علاوہ اور کسے پکار سکتے تھے؟ ان کی مدد ان پر لازم تھی۔ اور اگر اس کے لئے جنگ ناگزیر ہو جائے تو جنگ بھی کی جا سکتی تھی۔ یعنی ظلم کی روک تھام کے لئے جنگ

مظلوموں کی امداد خواہ وہ ظلم کہیں ہو رہا ہو۔ اس لئے کہا گیا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ

اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا ۔ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا (۴/۷۵) (مسلمانو!) تمہیں کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کرو ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لئے جو (چیخ چیخ کر) پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے بسنے والے اس قدر ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی پشت پناہ بنا اور اپنے حضور سے ہمارا کوئی مددگار بھیج۔

فرائضِ رسالت

لڑائیوں کا یہ سلسلہ سات آٹھ سال تک مسلسل رہا تاکہ (آخرالامر) مکہ فتح ہو گیا اور یوں ہر طرف دینِ خداوندی غالب آگیا۔ اس دوران میں آپؐ اس نظامِ نو کی تشکیل اور اس کے مختلف گوشوں کی تعمیر و تحسین کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اس پروگرام کی متعدد شقیں تھیں۔ مثلاً

(۱) سب سے پہلی شق یہ کہ جو کچھ آپؐ پر خدا کی طرف سے نازل ہو اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا کہ یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (۵/۶۷)۔ اے رسول! جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے۔

(۲) لوگوں کو قوانین اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دینا اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (۶۲/۲)۔ یہ رسول لوگوں کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کرتا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے۔ انہیں قوانینِ الٰہیہ اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے۔

(۳) خود قرآن کریم کا اتباع کرنا (۶/۵۰) اور اپنی جماعت کو حکم دینا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖۤ اَوْلِیَآءَ (۷/۳) جو کچھ اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دوسرے کارسازوں کا اتباع مت کرو۔

(۴) لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کرنا۔ اس کے لئے ارشادِ خداوندی تھا فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (۵/۴۸)۔ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق ان میں فیصلے کر۔ اس لئے کہ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

(۵) امورِ مملکت کے فیصلے اپنی جماعت کے مشورے کے ساتھ سرانجام دینا۔ اس کے لئے حکمِ خداوندی تھا وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (۳/۱۵۸) اے رسول! تو معاملات میں اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا کر۔ اور جب اس کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ جائے تو پھر قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے، معاملہ پیشِ نظر کی سرانجام دہی

کے لئے عمل پیرا ہو جا۔ اس جماعت کی اہمیت اور قدر و منزلت کو، خدائے بزرگ و برتر نے ان وجد آفریں الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

جماعتِ مومنین

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸/۲۹)

محمد اللہ کے رسول اور ان کے ساتھ (قدوسیوں کی جماعت) جن کی خصوصیت یہ ہے کہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت لیکن باہمد گر سراپا رأفت و رحمت ہیں۔ وہ دنیا میں کسی طاغوتی طاقت کے سامنے نہیں جھکتے۔ جھکتے ہیں تو فقط ایک اللہ کے سامنے۔ اُسی سے وہ فضل و عنایت کے خواہاں اور اسی کی رضا جوئی کے طالب۔ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے سے ان کے دل میں اطمینان و سکون اور شادابی و شگفتگی کی جو جنت پیدا ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں۔ یہی ہے قدوسیوں کی وہ جماعت جس کے تذکرے تورات و انجیل میں آچکے ہیں۔ یہ جماعت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ حق و صداقت کی لہلہاتی کھیتی ہے جس کی کیفیت یہ تھی کہ ایمان کی زمین میں صالح اعمال کا تخم حسنہ نرم و نازک پتی کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر اس میں تقویت پیدا ہوئی تو وہ ایک شاخِ نو دمیدہ کی صورت اختیار کر گیا۔ پھر اس میں اور توانائی پیدا ہوئی تو وہ دیکھو وہ ایک سرسبز و شاداب کھیتی بن گیا جسے دیکھ کر کسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور حاسدوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ یہ تھے حفاظت اور اجرِ عظیم کے وہ درخشندہ وعدے جو اللہ نے ایمان و اعمالِ صالحہ کے بدلے میں اس جماعت کے ساتھ کئے تھے اور جنہیں اس کی شانِ ربوبیت نے اس حسن و رعنائی سے پورا کیا۔

ذرا جماعتِ مومنین کی اس خصوصیتِ کبریٰ پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ اقبال کے الفاظ میں

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

حضورؐ کو اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان امور میں خدا کی طرف سے وحی نہیں آتی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جو امور وحی کی رو سے طے پا جائیں ان میں انسانوں سے مشورے کیا معنی؟ یہ امور وحی کے قوانین کی روشنی

ہیں، زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ عقل و فکر کی رُو سے طے کئے جاتے تھے جس میں غلطی کا امکان بھی تھا۔ اس کے لئے واضح

غلطی کا امکان

الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَا اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ. وَ اِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْ اِلَیَّ رَبِّیْ. اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (۳۴/۵۰) ان سے کہہ دو کہ میں اگر کبھی غلطی کر جاتا ہوں تو وہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے اور جب میں صحیح راستہ پر ہوتا ہوں تو وہ اس وحی کی بنا پر ہے جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر ایک کے قریب ہے ــــ جو کچھ وحی کی رُو سے ملتا تھا۔ اس میں نہ رسول اللہ کو کسی قسم کا اختیار ہوتا تھا اور نہ جماعتِ مومنین کو۔ لیکن جو امور ذاتی رائے پر چھوڑ دیئے جاتے تھے ان میں لوگوں کو ایسی آزادیٔ رائے اور حریتِ فکر و عمل حاصل تھی جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اسی آزادیٔ فکر و رائے کا نتیجہ تھا کہ ایک عام

آزادیٔ فکر

عورت تک اپنے معاملہ میں حضورؐ کے ساتھ پوری جرأت کے ساتھ جھگڑ سکتی تھی۔ ایسی جرأت جس کی شہادت خود اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر دی کہ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا. وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ. وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا. اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۵۸/۱) اللہ نے اس عورت کی بات کو سن لیا جو تجھ سے (اے رسول) اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑتی تھی۔ اور اللہ کے حضور شکایت کرتی تھی۔ وہ تم دونوں کی گفتگو کو سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سننے والا۔ جاننے والا ہے ــــ اور جب آپؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید سے کہا کہ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷)۔ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ، اسے طلاق مت دے۔ تو انہوں نے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور بیوی کو طلاق دیدی۔ اس سے نہ مشورہ دینے والے کے دل میں کوئی ملال پیدا ہوا، نہ مشورہ سے انکار کر دینے والے کے دل میں کسی قسم کا خیال۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کا مشن ہی یہ تھا کہ نوعِ انسان کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے علاوہ ہر قسم کی غلامی اور تحکمی سے نجات دلائی جائے۔ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷)۔ اس رسول کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ یہ انسانوں کے سر سے وہ بوجھ اتار دے جن میں وہ دبے ہوئے تھے۔ اور انہیں ان زنجیروں سے آزاد کرا دے جن میں وہ جکڑے چلے آ رہے تھے۔ تیئس سال کی مسلسل جدوجہد سے آپؐ نے وہ فضا پیدا کر دی جس میں ہر انسان پوری پوری آزادی کا سانس لے رہا تھا اور علیٰ وجہ البصیرت محسوس کرتا تھا کہ وہ سوائے قوانینِ خداوندی کے کسی کا محکوم اور غلام نہیں۔ اس طرح یہ حقیقت ہر ایک کے سامنے ابھر کر آ گئی کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ. وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا سے کتاب اور حکومت اور نبوت لے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم بن جاؤ (اسے یہی کہنا چاہیے کہ) تم اس کتاب خداوندی کی رُو سے جس کی تم تعلیم دیتے ہو اور جس کے مطالب کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو اپنے رب کے بندے بن جاؤ۔ اسی حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے آپؐ بار بار اس کا

بشریت

اعلان فرمادے تھے کہ (قُلْ) اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰىٓ اِلَيَّ (۱۸/۱۱۰) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ فرق یہ ہے کہ میری طرف خدا کی جانب سے وحی آتی ہے، اور میں خود اس وحی کا اتباع کرتا ہوں۔ (۱۸/۱۱۰)

اس طرح حضورؐ کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہو گئی اور خدا نے اعلان کر دیا کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶/۱۱۵)۔ اور تیرے رب کی باتیں صدق و عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ خدا کی یہ باتیں جو اس نے نوع انسان کی ہدایت کے لئے دی تھیں، قرآن کریم میں جمع ہو گئیں جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) یقیناً ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ قانونِ فطرت کے مطابق آپ کی حیاتِ طبعی بھی ایک دن ختم ہو جانے والی ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (۳۹/۳۰) اور جماعت مؤمنین سے کہہ دیا کہ حضورؐ کی وفات سے اس

حضورؐ کے بعد

نظام میں قطعاً کوئی فرق نہیں آسکتا جسے آپ نے وحی خداوندی کی روشنی میں متشکل فرمایا ہے۔ یاد رکھو وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ محمدؐ بجز اس حیثیت کے خدا کے ایک پیغامبر ہیں۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ آپ سے پہلے بھی خدا کے کئی رسول آئے اور گزر گئے۔ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ سو اگر وہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ صرف آپ کی ذات تک محدود تھا، اپنے پچھلے نظام کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا (۳/۱۴۳) جو تم میں سے الٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

رسول کا فریضہ یہ تھا کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷/۱۵۷) وہ لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دیتا ہے جنہیں قرآن نے صحیح تسلیم کیا ہے اور ان سے روکتا ہے جنہیں قرآن نے ناپسندیدہ ٹھہرایا ہے۔ رسول اللہ کے بعد یہی فریضہ تمہارا ہوگا۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو۔ یہ معروف و منکر اس کتاب کے اندر ہے جس کا تمہیں وارث بنایا جا رہا ہے۔ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ..... (۳۵/۳۲) لیکن اس کے لئے ایک بنیادی شرط ہے، اور وہ یہ کہ

علیٰ خلق عظیم

تمہارے رسول نے یہ کچھ اس لئے کر کے دکھا دیا تھا کہ وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز تھا وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴) اس لئے تمہیں بھی بلند ترین اخلاق کا حامل بننا ہوگا۔ اس باب میں رسول کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)

اس کا (TEST) اور معیار یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ بھرے مجمع میں مخالفین سے کہتے تھے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶) میں نے تمہارے اندر اس سے پہلے اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں! اسی طرح تم میں سے بھی جو کوئی اپنے مخالفین کے سامنے سینہ تان کر اس کا دعویٰ کر سکیگا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ وہی رسول اللہ کے نقشِ قدم پر چلنے والا ہوگا اور اس قسم کے لوگوں کے ہاتھوں یہ نظام آگے بڑھے گا۔ نبی اکرمؐ کے خلقِ عظیم کا اعتراف صرف آپؐ کے مخاطبین ہی نے نہیں کیا۔ دنیا کے بڑے بڑے مورخین اور مفکرین اس باب میں رطب اللسان ہیں۔ اور (LAMARTINE) کے الفاظ میں باوازِ بلند کہتے ہیں کہ

> ان تمام معیاروں اور پیمانوں کو اپنے سامنے رکھئے جن سے انسانی عظمت و بلندی کو ماپا
>
> اور پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد بتائیے اس سوال کا جواب دو کہ — کیا دنیا میں اس سے
>
> بڑا انسان کبھی کوئی پیدا ہوا ہے؟　　(معراجِ انسانیت ص۳۳)

یہ ہیں نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے وہ نمایاں خط و خال جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔ قرآن کریم نے اس زریں داستان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن ہم نے اس مقام پر اختصار سے کام لیا ہے۔ یہی حضورؐ کی وہ سیرتِ مقدسہ ہے جس کے حرفاً حرفاً سچا ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ (۲/۲)۔ باقی رہے تاریخی واقعات۔ سو ظاہر ہے کہ ان میں وہی سچے قرار پا سکتے ہیں جو حضورؐ کی سیرتِ قرآنیہ کے مطابق ہوں۔ یہی وہ حسنِ سیرت اور رعنائی کردار ہے جس کے پیشِ نظر خدا اور اس کے فرشتے اس ذاتِ گرامی پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۳۳/۵۶)

صرف حضورؐ پر ہی نہیں بلکہ اس جماعتِ مومنین پر بھی جو حضورؐ کے اتباع میں نظامِ خداوندی کے قیام کا باعث بنتی ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (۳۳/۴۳)

لاہور سے ہر قسم کی علمی۔ ادبی۔ معاشی۔ سیاسی کتابیں منگانے کیلئے

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور ——— کو ——— ایک کارڈ لکھ دیجئے

عصرِ حاضر کی بے مثال تصنیف

"انسان نے کیا سوچا؟"

از:- پرویز

پاکستان کے ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین!

"فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین ہی کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ انداز تحریر ایسا سجھا ہوا ہے کہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہیئے اس طرح ان کی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام و دینِ حق سے قرب پیدا ہوگا۔"

(روزنامہ "نوائے وقت" لاہور)

"مصنف نے نہایت جامع اور بھرپور انداز میں مفکرینِ عالم کے خیالات کو ترتیب دے کر ایک واضح تصویر پیش کی ہے یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور انہیں اس گمراہی سے بچانے کی کامیاب سعی کرتی ہے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذہان میں پیدا ہو رہی ہے۔ چار سو صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے اور فاضل مصنف کے تبحرِ علمی کا ثبوت۔"

(ہفت روزہ "قندیل" لاہور)

ٹائپ کی حسین طباعت ــــ سفید کاغذ ــــ جلد مضبوط ــــ گرد پوش دیدہ زیب

قیمت ــــــ بارہ ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

کل پاکستان انجمن ترقی اُردو کا پندرہ روزہ ترجمان

"قومی زبان"

جو ایک عرصے سے بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کی زیر نگرانی اُردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے اور جس کا ہر شمارہ بیش بہا معلومات کا خزینہ ہوتا ہے

چند مستقل عنوانات:-

- حرفے چند:- (چند ادبی مسائل کا تجزیہ)
- آئینہ:- (ہر ماہ کے اردو ادبی رسائل کا جائزہ)
- گرد و پیش:- (ادبی، علمی اور ثقافتی خبریں)
- رفتار ادب:- (اردو کے اشاعتی اداروں سے متعلق معلومات)
- تبصرے:- (اردو کی تازہ ترین کتب پر بے لاگ تبصرے)
- غزل نما:- (اہم شعری مجموعوں کی غزلوں کا انتخاب)

قیمت فی پرچہ:- چار آنے ——— سالانہ:- پانچ روپے

دفتر "قومی زبان"

انجمن ترقی اُردو (پاکستان)- اُردو روڈ ——— کراچی

سلیم کے نام

(ذات، جذبات، عقل سے متعلق چند سوالات)

تم نے عزیزم! بار بار پوچھا ہے؟ میں ان کا ہزار بار اعادہ کرتے کبھی نہیں اکتاؤں گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں ساری عمر دہراتے رہنا ہوگا اس لئے کہ خدا، رسول، وحی، آخرت، ضابطہ قوانین، اخلاق، غرضیکہ ان سب کا دارومدار انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کے ایمان پر ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا اور انسان کو محض اس کے طبیعی جسم سے عبارت سمجھتا ہے، اس کے لئے سوائے معاشرہ کے قوانین کے نہ کسی بلند ضابطہ قوانین کی ضرورت ہے نہ مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا، رسول، وحی، آخرت وغیرہ پر ایمان کی ضرورت ہی مستقل اقدار کے لئے پڑتی ہے یعنی وہ اقدار جن کے تحفظ سے انسانی ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہوتی ہے۔ انسانی عقل ان اقدار کا انکشاف نہیں کر سکتی۔ وہ انہیں (DISCOVER) نہیں کر سکتی۔ عقل انسانی میں ذاتی طور پر اس کی استعداد ہی نہیں ہوتی کہ وہ خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔ عقل انسان کے اندر ایک ایسا ملکہ ہے جو علم (KNOWLEDGE) اور تجربہ (EXPERIENSE) کی

مستقل اقدار اور عقل

روشنی میں استنباطِ نتائج کرتا ہے۔ یعنی کسی شخص کو جس قسم کا اور جس قدر علم اور تجربہ حاصل ہو، اس کی عقل اسی کے مطابق نتائج اخذ کرتی ہے۔ انسان کو مستقل اقدار کا علم ابتداءً وحی کے ذریعے ملا۔ یہ جو ہم قدیم فلاسفرز کے ہاں کہیں کہیں مستقل اقدار کی جھلک پاتے ہیں تو وہ ان کی عقل کی پیداوار نہیں ہیں۔ ان کی بنیاد بھی وحی کے علم پر ہی ہے۔ ہوا یوں کہ حضرات انبیائے کرام ہر قوم اور ہر زمانہ میں آتے رہتے اور لوگوں کو مستقل اقدار کا علم دیتے رہتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ حتیٰ کہ ان کا نام بھی لوگوں کو بھول گیا۔ لیکن ان کا عطا کردہ علم (فضا میں) باقی رہ گیا۔ کہیں کہیں اپنی اصلی شکل میں لیکن بالعموم انسانی خیالات کی آمیزش کے ساتھ۔ یہی وہ

منتشر علم تھا جس سے فلاسفر، شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوتے تھے۔ اس طرح ان کی فکر میں بعض مستقل اقدار کی جھلک آجاتی تھی۔ ان اقدار کی جھلک کے علاوہ اگر ان کی زندگی کو دیکھا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی پیداوار تھے۔ یہی کیفیت خود عصرِ حاضر کے مفکرین کی ہے۔ ان کے ہاں جہاں جہاں فضا میں پھیلی ہوئی مستقل اقدار کے اثرات ملتے ہیں وہ مقامات چمکتے دمکتے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی کی دوسری راہوں میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے۔ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا (۲/۲۰)

یہ اقدار آخری مرتبہ اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دی گئی ہیں۔ قرنِ اول کے مسلمانوں نے ان پر عمل کیا اور ان کے جیتے جاگتے درخشندہ و تابندہ شگفتہ و شاداب نتائج دنیا کے سامنے آگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے ان اقدار کو چھوڑ دیا اور دنیا کی عام روش پر چل پڑے۔ جہاں تک اُس دور کی تاریخ کا تعلق تھا انھوں نے (غالباً خود بھی یہی سمجھا اور) دنیا کو بتایا کہ ان کامرانیوں اور شادکامیوں کا راز ان چند شخصیتوں میں تھا جو اس زمانے میں کسی طرح پیدا ہو گئی تھیں۔ اگر وہ دنیا کو یہ بتلاتے کہ وہ کامرانیاں نتیجہ تھیں ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو قرآن میں محفوظ ہیں، تو دنیا اس تجربہ کو ایک سائنس کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھتی۔ اس طرح اس کا امکان تھا کہ اس تجربہ کا اعادہ کسی اور خطۂ زمین میں بھی ہو جاتا۔ (سائنس سے مراد یہ ہے کہ جس طریق پر عمل کرنے سے ایک مرتبہ ایک خاص نتیجہ پیدا ہوا تھا اس طریق پر جب اور جہاں بھی عمل کیا جائے گا وہی نتیجہ مرتب ہو گا۔) مسلمانوں نے ایسا نہ کیا اور انسان اپنی عقل کے تجرباتی طریق سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا آگے بڑھتا چلا آیا۔ اس کے ساتھ ہی جوں جوں تعصب اور جہالت کے بادل چھٹتے گئے انسان نے اسلام کے قرنِ اول کے تجربہ پر تحقیقاتی نظر ڈالنی شروع کی اور اس طرح حقیقت کے بعض گوشے دنیا کے سامنے آگئے۔ یہ جو تم اس زمانہ میں دیکھتے ہو کہ زندہ اقوام نے بعض مستقل اقدار کو اپنا لیا ہے اور بعض اقدار کے قریب تر آرہی ہیں۔ اس کی وجوہات یہی ہیں (جو اوپر بیان کی گئی ہیں) یعنی (۱) قرآنی تعلیم سے متاثر خیالات جو فضا میں عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں (۲) جو مفکرین ان خیالات سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں یا جنھوں نے قرآنی اقدار کا خود مطالعہ کیا ہے۔ ان کا اعترافِ حقیقت۔ (۳) انسانی علم اور تجربہ جو نسلاً بعد نسلٍ آگے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ (یعنی ACCUMULATIVE HUMAN KNOWLEDGE AND EXPERIENCE جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے)۔ اور (۴) اس پر مبنی عقل کا تجرباتی طریق۔

جیسا کہ میں متعدد بار پہلے بتا چکا ہوں، انسانی عقل (HUMAN INTELLECT) صرف اس علم یا معلومات (DATA) کی بنا پر استنباط یا استنتاج کر سکتی ہے جو اُسے حاصل ہوں۔ استنباط یا استنتاج کے اس طریق کو (REASONING) کہتے ہیں۔ عقل کے پاس جس قسم کا اور جس قدر (DATA) ہو گا وہ اسی قدر اور اسی قسم کا (REASONING) کر سکے گی۔ یاد رکھو جو حیثیت خارجی دنیا میں علت (CAUSE) کی ہے وہی حیثیت انسانی دنیا میں دلیل و برہان (REASON) کی ہے۔ جس طرح (CAUSE) سے ایک (EFFECT) پیدا ہوتا ہے اسی طرح (REASON) سے نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اگر ہم

عصرِ حاضر کی عقل کو قرآنی اقدار کا علم زیادہ سے زیادہ دیں اور اسلام کے قرنِ اول کے تجربہ کو سائنس کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کر دیں تو یہ عقل بالآخر صحیح نتائج تک پہنچ جائے گی۔ (اسی کو اقبالؒ "ادب خوردۂ دل" سے تعبیر کرتے ہیں) اس کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قرنِ اول کے تجربہ کو ایک بار دنیا کے سامنے پھر پیش کیا جائے۔ یعنی مسلمان اپنی کسی مملکت کا نظام قرآن کی مستقل اقدار کے مطابق متشکل کر کے دنیا کو عملاً بتا دیں کہ یہ اقدار کس قسم کے نتائج مرتب کرتی ہیں۔ میری کوشش یہی ہے کہ یہ تجربہ گاہ پاکستان کا خطۂ زمین بنے ——— یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است۔

انسانی ذات کا سراغ

اب تمہارا یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ہم اپنی ذات (PERSONALITY) کو محسوس کیسے کریں؟ ہمیں اس کی ہستی (EXISTENCE) کا پتہ کیسے چلے؟ اگر انسانی ذات مادی یا طبیعی (PHYSICAL) شے ہوتی تو تمہارے سوال کا جواب نہایت آسان تھا۔ تمہیں کسی ہسپتال کے اپریشن تھیٹر میں لے جا کر (پیٹ چاک کردہ مریض) کو دکھا دیا جاتا کہ یہ دیکھو دل، یہ جگر، یہ پھیپھڑے، یہ گردے۔ اور یہ ذات۔ لیکن انسانی ذات تو طبیعی شے نہیں۔ اسے تشریحِ بدن (ANOTAMY) سے کیسے دکھایا جا سکتا ہے؟ یہ تو بڑی مشکل ہے جس کی طرف ریاض مرحوم نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

کیسے دکھائے کوئی خونِ آرزو کیسا ہے
انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگ و بو کیا ہے

"خونِ آرزو" کا رنگ و بو کیسے دکھایا جا سکتا ہے؟ لیکن "خونِ آرزو" کا اندازہ کرایا جا سکتا ہے۔ مادی نظریۂ حیات کے علمبردار (MATERIALISTS) ہمیں بتاتے ہیں کہ انسانی جذبات اور اس کا کیرکٹر، اس کے طبیعیاتی جسم (PHYSICAL BODY) کے مختلف عناصر کے اعمال و افعال (FUNCTIONS) سے مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا بیشتر حصہ ان (GENES) میں پوشیدہ ہوتا ہے جسے ایک بچہ ماں باپ سے وراثتاً (BY HEREDITY) پاتا ہے۔ اس کے جذبات اس کے غدودوں کے افعال کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً (PANCRREAS) سے (ADRENALIN) خارج ہوتی ہے جس سے خوف کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف (DUCTLESS GLANDS) سے، جن میں (PITUITARY) کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہے، مختلف رطوبتی مادے (SECRETIONS) خارج ہوتے ہیں جو مختلف جذبات کے ذمہ دار ہیں۔ ان سے آگے بڑھ کر وہ اعصاب (NERVES) اور دماغ (BRAIN) کو سامنے لاتے ہیں جو بڑے اہم فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بس انہی کے مجموعہ کا نام انسان ہے۔

بہت اچھا۔ لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے بڑے سے بڑے سائنسدان کی گھڑی چرائے تو وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ اس کا فلاں غدود رطوبتی مادہ کم خارج کر رہا ہے جس کی وجہ سے اس نے چوری کی ہے اسے وٹامن (A) کی گولیاں کھلائی جائیں۔ وہ

پولیس اس کی رپورٹ درج کرائے گا۔ اور مجرم کو عدالت سے سزا دلوائے گا۔ یعنی وہ اس جرم کی ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کسی غدود پر عائد نہیں کرے گا۔ خود اس انسان پر عائد کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان عبارت ہے انہی ہڈیوں اور غدودوں سے اور اس کے اعمال کے ذمہ دار ان سے نکلنے والے رطوبتی مادے ہی ہیں۔ تو پھر یہ "انسان" کیا بلا ہے جسے آپ اس جرم کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں؟

اس سے تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ بڑے سے بڑا مادہ پرست بھی اس امر کے اعتراف پر مجبور ہے کہ انسانی فیصلوں کے ذمہ دار اس کے پھیپھڑے، گوشت، دل، جگر، دماغ، جوڑ توڑ اور غدود نہیں۔ ان کا ذمہ دار خود انسان ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ذمہ دار اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے جو صاحب اختیار و ارادہ ہو۔ انسانی زندگی سے ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا عنصر خارج کر دیجئے اور پھر سمجھئے کہ انسانی دنیا کی کوئی چیز بھی باقی رہ سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ انسانی دنیا، انسان کی دنیا کہلانے کی اسی وقت مستحق ہے، جب انسان کو ذمہ داری کا حامل تسلیم کیا جاتا ہے۔ انسان اور حیوان میں فرق ہی یہی ہے۔ جب کسی شخص کی بھینس تمہارے کھیت میں گھس آئے تو تم بھینس کے خلاف نالش نہیں کرتے۔ اس کے مالک کے خلاف کرتے ہو۔ اور کوئی جج اس شخص کے اس عذر کو تسلیم نہیں کرتا کہ میرے فلاں غدود کی رطوبت خارج ہو گئی تھی اس لئے مجھ سے یہ جرم سرزد ہو گیا ہے۔ اس کا ذمہ دار میں نہیں۔ انسان کی (FREE WILL) اس کی (FREEDOM OF CHOICE) ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو اپنے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں۔ اسے ہر صاحب ہوش تسلیم کرتا ہے۔ اس کا ہر ایک کو اقرار ہے۔

یہی چیز ہے جو انسانی ذات (PERSONALITY) کی دلیل ہے۔ اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔

اختیار و ارادہ

یوں سمجھو کہ جس طرح روشنی اور حرارت سورج کی ہستی کا نشان اور اس کے وجود کے مظاہر ہیں اسی طرح اختیار و ارادہ انسانی ذات کے مظاہر ہیں۔ اور اسی سے انسان اپنے ہر فیصلہ اور ہر فعل کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ کوئی انسان اپنی اس خصوصیت کو ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے انسان کا وجود اور یہ خصوصیت (یعنی اس کی ذات) لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی انسان اپنی ذات کی دلیل آپ ہے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ (۷۵/۱۴-۱۵)۔ انسان اپنی ذات پر آپ دلیل ہے۔ خواہ اس کے خلاف وہ کتنے ہی عذر کیوں نہ پیش کرے۔

انسانی ذات زندگی کے ہر دوراہے پر فیصلہ کرتی ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ جب .... دو (POSSIBILITIES) اس کے سامنے آتی ہیں تو وہی ان میں سے ایک کا انتخاب کرتی ہے۔ وہ فیصلہ کرتی ہے اور اس کے بعد انسانی جسم (اس کے غدود، دماغ، عضلات وغیرہ) اس فیصلہ کو عمل میں لانے کے لئے حرکت میں آتے ہیں۔ جسم کی مشینری کی (CONTROLING AGENCY) انسانی ذات ہے۔ اس لئے اس کے اعمال کا ذمہ دار جسم نہیں، انسان خود... یعنی اس کی ذات ہے۔ یہی وہ شے ہے جس سے انسان اپنے آپ کو "میں" (I) کہتا ہے۔ میرا ہاتھ، میرا پاؤں، میرا دماغ، میرے غدود، میرا جسم ... یہ سب "میں" کی ملکیت ہیں۔ یہ "میں" (انسانی ذات) جسم کی موت کے ساتھ ختم

نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ اس کا آئندہ کا مقام موجودہ زندگی کے اعمال کے مطابق متعین ہوتا ہے جن کی تمام ذمہ داری اس پر ہوتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کہتے ہیں اور یہی درحقیقت ایک مادہ پرست اور مومن کے نظریۂ حیات میں بنیادی فرق ہے۔

لیکن یہ میں (انسانی ذات) انسان کو نشوونما یافتہ شکل میں نہیں ملتی۔ اس کی نشوونما کرنا انسانی زندگی کا مقصود ہے یہ جس قدر نشوونما یافتہ ہوگی، اس کی پہلی علامت یہ ہوگی کہ اس کے فیصلے اسی قدر محکم اور اس کے ارادے اسی قدر راسخ ہوں گے۔ گھڑی گھڑی بدلنے والے فیصلے اور — کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے — انداز کے ارادے کمزور ذات کی نشانی ہیں۔

تکریمِ ذات

جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) (ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے) تو اس سے بتانا یہی مقصود ہے کہ ہر انسانی بچہ کو ذات (PERSONALITY) عطا ہوتی ہے اور ہر (PERSONALITY) پر دوسری (PERSONALITY) کی تکریم (RESPECT) لازم ہے۔ اسی کو احترامِ آدمیت کہتے ہیں۔ یعنی تکریمِ ذات۔ اور چونکہ ذات کے معنی انسان کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے اس لئے تکریمِ ذات سے مراد یہ ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کا اختیار و ارادہ سلب کر کے اس سے اپنے فیصلے منوائے۔ وہ دوسرے انسان کو مشورہ دے سکتا ہے اسے معلومات بہم پہنچا سکتا ہے۔ یعنی جو باتیں اس کے پاس ایسی ہیں جو دوسرے انسان کے پاس نہیں، وہ ان باتوں کو اسے دے کر معلومات کے اعتبار سے اسے اپنی سطح پر لا سکتا ہے لیکن اس سے اپنا فیصلہ نہیں منوا سکتا۔ اسے اپنے لئے فیصلہ اسے خود کرنا ہوگا۔ اس کی ذات کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دوسرے کی ذات کی تکریم کرے یعنی اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کر کے اس سے اپنا فیصلہ نہ منوائے۔ اور اس کی ذات کی پختگی کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے لئے فیصلہ آپ کرے۔

صحیح معاشرہ

یہی ایک معیار ہے سلیم! جس سے غلط اور صحیح معاشرہ یا نظام کی پرکھ ہوتی ہے۔ جس معاشرہ یا نظام میں، افراد جس حد تک اپنے فیصلے آپ کرنے کا حق رکھیں۔ اور وہ معاشرہ انہیں اس حق کے استعمال کے لئے ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے۔ اسی حد تک وہ معاشرہ حق پر مبنی اور شرفِ انسانیت کا ضامن ہوگا۔ جس معاشرہ میں فرد، دوسروں کے فیصلے ماننے پر مجبور ہو، وہ معاشرہ اسی حد تک ظلم و استبداد (یعنی باطل) پر مبنی، اور وجہ تذلیلِ انسانیت ہوگا۔ قرآن کریم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کے لئے آیا تھا جس میں کسی پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو۔ اور اس طرح کسی انسانی ذات کی تحقیر و تذلیل نہ ہونے پائے۔ اس تکریمِ ذاتِ انسانی کی ابتداء خود ذاتِ خداوندی نے کی۔ جب اس نے کہا کہ ہم انسان سے کوئی بات بہ جبر نہیں منوانا چاہتے۔ اگر اس سے کوئی بات بہ جبر منوانی ہوتی تو ہم اسے اختیار و ارادہ دیتے ہی کیوں! ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔ اب اس کی مرضی ہے کہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے۔ یہ جس قسم کا راستہ اختیار کرے گا اس کے نتائج

اسے بھگتنے پڑیں گے۔ اگر یہ صحیح راستہ اختیار کرکے اپنی ذات کی نشوونما کرے گا تو حال اور مستقبل، دونوں کی خوشگواریوں کا مستحق قرار پائے گا۔ اگر غلط راستہ اختیار کرے گا تو تباہ و برباد ہو جائے گا۔

خدا نے خود اپنے متعلق یہ اعلان کرنے کے بعد واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو بھی اس کا حق حاصل نہیں خواہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ کسی سے اپنا حکم منوانا وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ ہم نے اپنے آخری رسول کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ وہ انسان کے سر سے اس بوجھ کو اتار دے جس کے نیچے یہ دبا چلا آ رہا ہے اور ان زنجیروں کو توڑ دے جن میں یہ جکڑا ہوا ہے۔

یوں اس معاشرے نے انسانی ذات کی بالیدگی کے سامان پیدا کر دیئے اور انسان، دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گیا۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں کوئی کسی سے یہ بھی اپنی بات نہیں منواتا تھا ـــــ خواہ یہ جبر ملوکیت یا مفاد پرست گروہ کا استبداد ہو یا مذہبی پیشوائیت کی عقیدتمندیوں کا رعب ہو (استبداد ملوکیت سے بھی زیادہ گراں نشین ہوتا ہے)۔ اس معاشرے کا انداز کیا تھا اسے سمجھانے کے لئے قرآن کریم نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا ہے جس کے بعد کسی دوسرے واقعہ کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے میں اس سے پہلے کئی مرتبہ بیان کر چکا ہوں (اور ابھی کئی مرتبہ بیان کروں گا۔ اس کی اہمیت کا یہی تقاضا ہے)۔ یہ واقعہ ہے حضرت زیدؓ کا ـــــ یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے نام صرف ایک صحابی کا لیا ہے اور

حریتِ ذات کی مثال

وہ حضرت زیدؓ ہیں ـــــ میں اس واقعہ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہ تمہیں معلوم ہی ہے۔ مجملاً یوں سمجھو کہ ایک طرف (حضرت) زیدؓ ہیں ـــــ حضرت خدیجہؓ کے غلام جنہوں نے انہیں رسول اللہؐ کو دیدیا تھا۔ حضورؐ نے انہیں آزاد کیا۔ پھر اپنا "منہ بولا بیٹا" بنایا۔ پھر قریش کے معزز ترین گھرانے کی خاتون، اپنی پھوپی زاد بہن سے ان کی شادی کی۔ اس سے تم اندازہ لگا لو کہ حضورؐ نے انہیں کہاں سے اٹھا کر کہاں پہنچا دیا۔

اور دوسری طرف ہیں خود رسول اللہؐ ـــــ حضرت زیدؓ کے اتنے عظیم محسن۔ بمنزلہ باپ۔ خدا کے رسول جن پر ایمان لانے سے حضرت زیدؓ مسلمان ہوئے تھے؛ اور اسلامی مملکت کے صدر اعظم۔

رسول اللہؐ حضرت زیدؓ سے کہتے ہیں کہ اپنی بیوی (یعنی میری بہن) کو طلاق مت دو۔

ذرا سوچو سلیم! کہ یہ کہنے والا کون ہے اور کس سے کہہ رہا ہے! پھر یہ بھی سوچو کہ ان حالات میں کوئی شخص اس حکم سے سرتابی کا تصور بھی کر سکتا تھا! لیکن وہ معاشرہ ہی کچھ اور انداز کا تھا۔ حضرت زیدؓ نے سنا اور بلا جھجک ـــــ کہہ دیا کہ آپ کا شکریہ۔ لیکن میں اس مشورہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔

چنانچہ حضرت زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ـــــ اور اس سے نہ تو مشورہ دینے والے کی پیشانی پر ذرا سا بھی بل پڑا اور نہ ہی حضرت زیدؓ کے دل میں قطعاً یہ خیال گذرا کہ میں نے حضورؐ کی گستاخی کی ہے۔

اسے کہتے ہیں انسانی ذات کی تکریم!!!

ہیں یہ لکھ رہا ہوں، اور ان خیالات کو بھی محسوس کر رہا ہوں جو بار بار تمہارے دل میں اُٹھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر قرآنی معاشرہ میں کوئی کسی سے اپنا حکم نہیں منوا سکتا تو قرآن کریم میں "خدا اور رسول کی اطاعت" پر جو اس قدر زور دیا گیا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہی میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔

انسانی ذات میں اس کی صلاحیت تو ہے کہ جب انسان زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہو تو وہ دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرلے۔ اسی کو اس کا اختیار و ارادہ کہتے ہیں۔ لیکن اس (انسانی ذات) میں اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ صحیح اور غلط راستے میں از خود تمیز کر سکے۔ اس کے لئے اُسے صحیح علم کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذات مد کے لئے سمیع (سننے والی) بصیر (دیکھنے والی) خبیر (باخبر) اور علیم (صاحب علم) ہونا ضروری ہے۔ اگر انسانی ذات کو ان مستقل اقدار کا علم ہو جن کے مطابق اس کی نشوونما ہوتی ہے اور ان کی صداقت پر یقین تو وہ ہر فیصلہ ان اقدار کے مطابق کرے گی۔ ورنہ اس کے فیصلے غلط ہوں گے۔

خیر و شر کا امتیاز

جب انسان ان اقدار کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ سوچ کر صحیح مانتا اور اس کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی ان کے مطابق بسر کرے گا تو اسے "ایمان" کہتے ہیں۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام "خدا کی اطاعت" ہے اور چونکہ ان اقدار کے مطابق زندگی اس قرآنی معاشرہ میں بسر ہو سکتی تھی جس کے مرکز رسول اللہ تھے، اسلئے اسے "اطاعت رسول" کہا گیا۔ اس سے تم نے دیکھ لیا کہ یہ "اطاعت" کسی خارجی قوت کا بہ جبر حکم منوانا نہیں، یہ اُن اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے جنہیں انسان، بہ طیب خاطر، بلا جبر و اکراہ، خود اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے، اپنے لئے اختیار کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر ان پر یہ پابندیاں خارج سے عاید کردہ (SUPER - IMPOSED) نہیں ہوتیں۔ خود عائد کردہ (SELF-IMPOSED) ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت اُس وقت ہوتی ہے جب دو افراد، کسی ایسے معاملہ کے تصفیہ کے لئے جس کا وہ خود فیصلہ نہ کر سکیں، برضا و رغبت کسی تیسرے شخص کو اپنا ثالث (حَکَم) مقرر کرلیں۔ اس ثالث کے فیصلہ کی اطاعت بہ جبر و اکراہ کسی کے حکم کی اطاعت نہیں ہوتی۔ جبر و اکراہ سے کسی کے حکم کی اطاعت میں، انسان کا سر تو جھکتا ہے لیکن اس کا دل اس سے (بادِ سرکشی) کرتا ہے۔ لیکن اپنے تسلیم کردہ ثالث کے فیصلہ کی اطاعت سے انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی محسوس نہیں کرتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے اظہار کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ مومن ہونے کی شرط یہ ہے کہ لوگ اپنے متنازعہ فیہ امور میں رسول اللہ کو اپنا ثالث (حَکَم) تسلیم کرلیں اور اس طرح حضورؐ کے فیصلوں کے خلاف دل میں گرانی تک محسوس نہ کریں۔

اطاعت

یہی کیفیت اس معاشرہ میں قانون کی اطاعت کی ہوتی ہے۔ اس میں قانون نام ہی مستقل اقدار کی چار دیواری کا ہوتا ہے۔ باقی رہیں قانون کی جزئیات تو وہ ان افراد معاشرہ کے باہمی مشورہ سے طے پاتی ہیں۔

قانون شکنی کی سزا

البتہ جو لوگ اس معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے قانون شکنی کریں، ان سے قانون کی اطاعت

یہ جبر کرائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ قانون شکنی کے معنی یہ ہیں کہ آپ دوسروں سے اپنا فیصلہ بہ جبر منوانا چاہتے ہیں۔ یہ استبداد ہے جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر آپ اس معاشرہ کی حدود کا احترام نہیں کرنا چاہتے تو آپ کو اس کا اختیار ہے کہ آپ اس معاشرہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ لیکن آپ کو اس کا حق نہیں دیا جا سکتا کہ آپ قانون شکنی کر کے دوسروں سے اپنے فیصلے بہ جبر منوائیں۔

باہمی تعاون اس معاشرہ میں مختلف کام، مختلف لوگوں کے سپرد کئے جائیں گے۔ لیکن یہ تقسیم کار ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے باہمی تعاون ہوگا۔ اس میں افسری اور ماتحتی کا سوال نہیں ہوگا۔ نہ ہی کوئی شخص محض "پیٹ" کی مجبوری سے دوسرے کا حکم بردار ہوگا۔ اس لئے کہ اس میں ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر پر ہوگی۔ اس بنیادی اصول کو یاد رکھو سلیم! کہ کوئی ذات کسی دوسری ذات کا آلۂ کار نہیں بن سکتی۔ یہ ذات کی نفی ہے۔ اس کی انتہائی تذلیل ہے۔

"مذہب" کیا چاہتا ہے؟ یہ تھا زندگی کا وہ قالب (PATTERN) جسے قرآن نے تجویز کیا تھا۔ اسے سامنے رکھو اور پھر نظر ڈالو اس قالب پر جسے "مذہب" انسان کے لئے تجویز کرتا ہے ("مذہب" میں ہمارا موقف "مذہب" بھی شامل ہے جو قرآن کے علی الرغم، انسانوں کا خود ساختہ ہے) مذہب کے تجویز کردہ قالب میں، زندگی کے کسی گوشے میں انسان کے اپنے فیصلے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں یا تو ہر فیصلہ پہلے سے کیا ہوا ہوتا ہے اور اگر کسی معاملہ میں یہ فیصلہ نہ ملے تو آپ کو کسی فیصلہ کرنے والے کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اس میں انسانی ذات کی نشوونما اور بالیدگی کے مواقع ہی نہیں ہوتے بلکہ یوں کہو کہ اس میں انسانی ذات کا تصور ہی نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس کی تکریم کا سوال پیدا ہو۔ اس میں ہر فرد کو کسی نہ کسی کا محکوم رہنا ہوتا ہے ـــــ حکمران سیادت کا محکوم۔ مذہبی قیادت کا محکوم۔ روحانی پیشوائیت کا محکوم۔ ہر "ان داتا" کا محکوم۔ بیوی کو میاں کا محکوم۔ اولاد کو (عاقل و بالغ ہونے کے بعد بھی) ماں باپ کا محکوم۔ حتیٰ کہ اگر اس میں خدا کی محکومی بھی اختیار کی جاتی ہے تو سزا کے ڈر سے ـــــ کہو سلیم! ایسے معاشرہ میں انسانی ذات کھل کر سانس بھی لے سکتی ہے؟

یہ تم جانتے ہو کہ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) کا جذبہ ہر ذی حیات میں جبلّی طور پر (BY INSTINCT) موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ذی حیات، فطرت کی طرف سے، اپنی جان بچانے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ انسان بھی ذی حیات ہے اور تحفظِ خویش کا جذبہ اس کے اندر بھی ہے۔ لیکن فطرت نے

تحفظِ خویش یہ ذریعہ بھی اس کی ذات کے سپرد کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس کا اختیار دیدیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اپنی جان کی حفاظت کرے اور چاہے اسے ہلاک کر ڈالے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی حیوان خودکشی نہیں کر سکتا۔ لیکن انسان خودکشی بھی کر سکتا ہے۔

خودکشی کا تصور بڑا بھیانک ہے اور پاگل پن کی نشانی۔ لیکن اسی چیز کو ذرا مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان

کی یہ ایسی خصوصیت ہے جس کی درخشندگی، تابناکی اور عظمت و شرف کا مقابلہ کوئی اور چیز نہیں کر سکتی۔ حیوانات کے سامنے زندگی کا مقصد محض زندہ رہتا (یا بچے پیدا کرنا) ہے۔ لیکن انسان کے سامنے بلند اور مستقل اقدار بھی ہیں۔ انسان کا یہ اختیار کہ وہ اپنے فیصلہ سے اپنی جان بھی دے سکتا ہے، اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ اگر کوئی وقت ایسا آجائے کہ اسے کسی بلند قدر کی حفاظت کی خاطر جان تک دینی پڑ جائے تو وہ جان دے کر اس قدر کی حفاظت کرے۔ یہ امتیاز کائنات میں کسی کو حاصل نہیں۔

کشمکش لیکن یہی چیز ہے جو بالعموم انسان کے سینے میں کشمکش بپا کا موجب بنتی رہتی ہے۔ ایک طرف انسانی ذات کا فریضہ اس کی طبعی زندگی (جسم) اور اس کے مفاد کی حفاظت ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس کا فریضہ بلند اور مستقل اقدار کا تحفظ ہوتا ہے جب تک انسان کی طبعی زندگی اور کسی بلند قدر میں تصادم نہیں ہوتا، معاملہ پرسکون رہتا ہے۔ لیکن جہاں ان دونوں میں تصادم ہو جائے، انسان کی ذات میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ انسانی ذات فیصلہ کیا کرتی ہے؟ اگر وہ بلند قدر کو قربان کر کے طبعی زندگی کے مفاد کو بچا لیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ذات حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوئی۔ اس میں اور حیوانات کے جذبۂ تحفظِ خویش میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اگر یہ طبعی زندگی کے فائدے کو قربان کر کے بلند قدر کا تحفظ کرتی ہے، تو اسے قامتِ انسانیت نصیب ہے (میں نے اس نکتہ کی وضاحت اپنے ایک لیکچر میں کی تھی امید ہے اسے الگ مقالہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے گا)

جب انسانی ذات، طبعی زندگی کے مفاد کے تحفظ میں، بلند اقدار کو قربان کر دیتی ہے تو اگرچہ اسے بھی انسانی ذات ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ذات کی ان دونوں سطحوں میں فرق کرنے کے لئے بہتر ہوگا کہ اس کا نام کچھ اور رکھ لیا جائے۔ تم اسے

الیغو الیغو (EGO) سے تعبیر کرو۔ چونکہ جذبات اور عقل انسانی ذات کے تابع چلتے ہیں، اس لئے جب یہ الیغو کے فرمان پذیر ہوتے ہیں تو جذبات (EMOTIONS) کی سطح بھی پست ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم انہیں ہوی کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اس لفظ کے مادہ میں "پستی" کا شائبہ مضمر ہے۔ تم انہیں (PASSIONS) کہہ سکتے ہو۔ اسی طرح جب عقل الیغو کے تابع چلتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے۔

ذہنی تسکین حیوانات کی طبعی زندگی کے قیام کے لئے صرف طبعی ضروریات کا پورا ہونا کافی ہے لیکن انسان کی طبعی زندگی کے تحفظ و بقا میں طبعی ضروریات کے علاوہ ذہنی تسکین (MENTAL SATISFACTION) کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔ یہ ذہنی تسکین، الیغو کے تابع چلنے والے جذبات مہیا کرتے ہیں۔ نام و نمود کی شہرت۔ معاشرہ میں عزت۔ اپنے ہمعصروں کی نگاہوں میں مقبولیت یا مسابقت۔ یہ سب اسی ذہنی تسکین کے ذرائع ہیں۔ انسان کے بہت سے کام جو بظاہر بڑے "نیک" دکھائی دیتے ہیں، ان کا محرک درحقیقت یہی تقاضا ہوتا ہے۔

ایک میر آدمی مسجد میں بڑا قیمتی قالین بچھاتا ہے۔ کسی ہسپتال میں ایک کمرہ بنواتا ہے جس کی پیشانی پر اس کے نام کی لوح منقوش ہوتی ہے۔ وہ یتیم خانہ بنواتا ہے جس کا چرچا سارے معاشرے میں ہوتا ہے۔ وہ غریب ہے تو نماز میں پڑھتا ہے

تاکہ محلہ میں نیک مشہور ہو جائے۔ بظاہر یہ کام بڑے نیک نظر آتے ہیں۔ لیکن درحقیقت انکو انھیں اپنی تسکین (SATISFACTION) کے لئے عمل میں لاتا ہے۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (۱۶/۶۳) "شیطان ان کے اعمال کو خوشنما بنا کر دکھاتا ہے"۔ انہی لوگوں کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۸/۱۰۴) ان کی تمام کوششیں طبعی زندگی میں ضائع ہو جاتی ہیں کیونکہ بلند اقدار کا تصور ہی ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ اور وہ (بزعم خویش) سمجھتے ہیں کہ وہ بڑی اچھی کاریگری کے کام کر رہے ہیں"۔ اگلی آیت میں ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو حیاتِ آخرت کے قائل نہیں۔ حیاتِ آخرت کا قائل وہی ہو سکتا ہے جو انسانی ذات پر ایمان رکھے۔ اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لئے سورۂ توبہ میں کہا گیا ہے کہ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ..... (۹/۱۹) کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا (یا اسی قسم کے دوسرے کام کرنے والے کو) اس جیسا سمجھ رکھا ہے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں مسلسل جد و جہد کی زندگی بسر کرتا ہے؟ تم اپنے فریب نفس کی رُو سے دونوں کو یکساں سمجھتے ہو تو سمجھتے رہو۔ میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

بعض لوگوں کو تم دیکھو گے کہ وہ اچھے کام (یعنی خدمتِ خلق اور ہمدردی کے کام) کرتے ہیں اور ان میں (بظاہر) ستائشِ خویش کا جذبہ بھی نہیں ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہوتے ہیں جن کا ستائشِ خویش کا جذبہ ان کے تحت الشعور میں کارفرما ہوتا ہے اور شعوری طور پر انھیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو ان کاموں کو محض تقلیداً (TRADITIONALLY) کرتے رہتے ہیں۔ یعنی ان کے خاندان میں یا جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی ہے اس میں اس قسم کے کام اکثر ہوتے رہتے تھے۔ وہ بھی ایسے کام کرنے لگ گئے اور اب عادۃً ایسا کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے برفار (CUSTOM - THOUGHT) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ کام گویا (AUTOMATON) قسم کے ہوتے ہیں محض مشین کی طرح۔ جیسے جب تم دفتر سے گھر آتے ہو تو تمہارے خیالات کہیں ہوں، تمہارے پاؤں خود بخود صحیح راستے پر چلتے اور درست موڑ مڑتے چلے جاتے ہیں اور تمہیں گھر پہنچا دیتے ہیں۔ اس قسم کے کام بھی کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرتے۔ ان کی یہ کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔

محض رسماً

اس کے برعکس، انسانی ذات (بمقابلہ انفو) انسانیت کی بلند اقدار کی خاطر طبعی زندگی کے مفاد کو قربان کر دیتی ہے۔ اس وقت وہ جذبات اور عقل جو اس کے تابع چلتے ہیں ان کا مقام بھی بلند ہو جاتا ہے اس لئے جو کام سرزد ہوتے ہیں ان کا جذبۂ محرکہ نام کی شہرت یا نمود کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ دوسروں کی خاطر جو کچھ کرتے ہیں انھیں برملا کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے متمنی ہیں، نہ شکریہ تک کے خواہاں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ سورۂ توبہ میں جہاں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کے صدقات کو قبول کر لیا کرو۔ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ۔ اور انہیں شاباش دیا کرو۔ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ یقیناً تمہاری شاباش ان کے لئے وجہِ تسکین ہوتی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ نبی کی تعریف سے ان مومنین کے ایگو کی تسکین ہوتی تھی۔ مفہوم یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ ان کے اس عمل کو سندِ قبولیت عطا کر دیتے تھے تو انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ وہ عمل فی الواقعہ مستقل اقدار کے عین مطابق تھا۔ اس یقین سے ان کا اطمینانِ قلب ہو جاتا تھا۔

انسان کی قیمت

ایگو کے طریق بھی عجیب ہوتے ہیں۔ وہ پہلے مادی چیزوں کو خود ہی ایک قیمت عطا کر دیتا ہے۔ اور پھر ان چیزوں کا مالک بن کر ان کی وجہ سے اپنی قیمت بڑھاتا ہے۔ لعل و جواہر پتھر کے ٹکڑوں کے سوا کیا ہیں؟ سونا محض ایک دھات ہے۔ ایگو پہلے ان چیزوں کو بیش بہا قرار دیتا ہے۔ پھر لعل و جواہر اور سونا چاندی کو جمع کرتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو واجب التکریم سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس کے برعکس انسانی ذات جن اقدار کو اپناتی ہے وہ فی ذاتہ گراں بہا ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت ذاتی (INTRINSIC) ہوتی ہے۔ اضافی (RELATIVE) نہیں ہوتی۔ ایگو اور ذات میں یہ بھی بہت بڑا فرق ہے۔

اور سب سے نمایاں فرق یہ کہ ایگو سب کچھ اپنے لئے حاصل کرنا (لینا) چاہتا ہے — خواہ وہ مادی اشیاء کی شکل میں ہو یا جذباتی تسکین کی صورت میں — لیکن ذات سب کچھ دوسروں کو دینے میں اپنی بالیدگی کا سامان پاتی ہے۔ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، انسانی عقل کی طرح، انسانی ذات میں بھی از خود خیر و شر کی تمیز کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ انسانی ذات فیصلہ کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسا ملکہ ہے جس سے انسانی اختیار و ارادہ کا ظہور ہوتا ہے اسے جس قسم کی تعلیم دی جائے گی، یہ اسی قسم کے فیصلے کرے گی۔ قرآن کریم انسان کو اس قسم کی تعلیم دیتا ہے جس سے اس کی ذات علیٰ وجہ البصیرت، بلند مستقل اقدار کی اہمیت پہچان لیتی ہے۔ اور جب انسان کی طبیعی زندگی اور کسی بلند قدر میں تصادم ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ بلند قدر کے حق میں ہوتا ہے۔ جب انسانی ذات سے اس قسم کے فیصلے صادر ہوں، تو اس وقت کہا جائے گا کہ اس کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو رہی ہے۔ ایگو کی سطح پر انسانی ذات غیر نشوونما یافتہ ہوگی۔

قرآن کریم ایک ایسا معاشرہ تشکیل کرنا چاہتا ہے جو ان افراد پر مشتمل ہو جن کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ افراد اسی غلط معاشرے میں سے نکلیں گے جس میں ایگو کی حکمرانی ہوگی۔ ایسے معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے اپنی ذات کی نشوونما کرنا بڑا مشقت طلب اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے لیکن جن افراد کے سامنے زندگی کی بلند اقدار آجاتی ہیں وہ ان مراحل کو طے کرتے ہیں اور ایک صحیح معاشرے کے قیام میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب ایسا معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو پھر دیگر افراد کو اپنی ذات کی نشوونما کے لئے آسانیاں میسر آجاتی ہیں۔ یہی وہ السابقون الاولون ہیں جو اس جنتِ ارضی کے معمار بنتے ہیں۔ اسی لئے قرآن

نے ان کے مدارج بڑے عظیم اور ان کا مقام بڑا بلند بتایا ہے۔ یہ سخت نامساعد ماحول میں اپنی ذات کی نشوونما کرتے ہیں اور اس کے بعد دوسروں کی ذات کی نشوونما کے لئے مساعد ماحول پیدا کرتے ہیں۔ ان کے لئے "دُہرا اجر" ہے۔

اس سے تم یہ بھی سمجھ گئے ہوگے کہ اسلامی معاشرہ کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایٹو کو انسانی ذات کی سطح پر لائے۔ اور یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر ناممکن ہے۔ ایٹو ایک متوازن ذات (BALANCED PERSONALITY) میں اسی صورت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ جب وہ ان تمام اقدار کا پابند ہو جائے جو قرآن کریم نے متعین کی ہیں۔ ان اقدار سے انکار تو کجا، اگر ان میں سے کسی قدر کو اختیار کر لیا جائے اور باقیوں کو چھوڑ دیا جائے تو بھی انسانی ذات کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم زندگی کا جو قالب (PATTERN) تجویز کرتا ہے اسے کلیتہً اختیار کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ ہیں سلیم! تمہارے سوالات کے مختصر سے جوابات۔ میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے نہ تم نے کبھی اس قسم کے مجرد (ABSTRACT) فلہذا مشکل حقائق کے متعلق سوالات کئے تھے اور نہ ہی میں نے اس انداز سے محض اشاروں سے بات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ تمہارے سوالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اب رفتہ رفتہ، اس میدان میں بہت آگے بڑھ گئے ہو۔ اور میں نے بھی اشاروں تک اکتفا اس لئے کیا ہے کہ میں اب تمہیں پہلی جماعت کا طالب علم نہیں سمجھتا۔ لیکن ان اشاروں کو سمجھنے کے لئے بڑے گہرے غور و فکر کی ضرورت ہوگی۔ غور و فکر سے کام لوگے تو ان اشارات کے پیچھے عمیق حقائق پوشیدہ ملیں گے۔

اچھا خدا حافظ۔ والسلام!

پرویز

کراچی کے دوستو!

آؤ اور ہر اتوار کی صبح کو نو بجے، سندھ اسمبلی ہال (متصل سعید منزل) بندر روڈ میں مفکر قرآن محترم پرویز صاحب سے سنو کہ قرآن کریم ہماری معاشرتی، سیاسی اور معاشی مشکلات کا کیا حل پیش کرتا ہے۔

قرآن کی بات ——— مفکر قرآن کی زبان سے

——— بزم طلوع اسلام کراچی کے زیر اہتمام

(مسلسل)

قائدِ اعظم

(۲)

زعیمِ انقلاب — برطانوی سامراج کے خلاف

(درا لاحرّیت میں تھی جس کی صدا بانگِ درا)

(محترم صفدر سلیمی صاحب)

ہندوستان اور پاکستان کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے کروڑوں انسان آج آزادی کی شاداب فضاؤں میں شاہراہِ حیات پر قدم بڑھا رہے ہیں۔ لیکن ایک وقت تھا جبکہ غیر ملکی سامراج کی کارفرمائیوں سے یہاں زندگی کی گذرگاہوں میں استعمار و استبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیرے پھیلا رکھے تھے۔ محکومی اور بے چارگی کی اس تاریک رات کو صبحِ بہارِ آزادی سے بدلنے کے لئے یہاں کے عوام کو کم و بیش نصف صدی تک حصولِ استقلال کی ایک طویل جنگ لڑنی پڑی۔ اشاعتِ زیرِ نظر میں ہم اس جنگ کی تفاصیل پیش نہیں کر رہے بلکہ پیشِ نظر موضوع کی مناسبت سے ہمیں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس جہادِ حریت میں قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ کا مقام کیا تھا اور اس تحریک استقلال کا فاتحانہ انجام کس حد تک اس نابغۂِ سیاست کے حسنِ تدبر اور رعنائی بصیرت کا رہینِ منت ہے۔

افترا پردازیوں کی تشہیر

اس داستان کا آغاز کرتے ہوئے ہم ان افسوسناک الزام بازیوں سے بے خبر نہیں جو سرزمینِ ایشیا کے اس عظیم المرتبت زعیم کے خلاف ان کے شکست خوردہ حریفوں کی زخم خوردہ اور منتقمانہ ذہنیت کی پیداوار ہیں اور جن کی تشہیر کا حقیقی سرچشمہ دراصل کانگریس کا وہ مہاسبھائی ذہن ہے جس کی شکست کے زخم آج تک مندمل نہیں ہو سکے۔ آل انڈیا کانگریس نے اگر بہتان طرازیوں اور افترا پردازیوں کی اس مذموم روش میں کروڑوں روپے پانی کی طرح

بہلائے ہیں تو اس کے محرکات کو سمجھنا قطعاً دشوار نہیں۔ اس روش پر نہ کسی اظہار افسوس کی ضرورت ہے اور نہ کسی شکوہ و شکایت کی۔ ہماری زندگی کی اصل بدنصیبی یہ ہے کہ الزام بازیوں کے اس محاذ پر ہمیں اپنی ہی ملت کے بڑے بڑے بزرگ نظر آتے ہیں۔ ان الزام بازیوں کا لب لباب انتہائی مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ قائد اعظمؒ کی ساری جدوجہد کا محور ملک کی تحریک آزادی کو ناکام بنانا تھا اور انھوں نے پاکستان کا جو نعرہ بلند کیا تھا اس کا منتہیٰ و مقصد بھی یہی تھا کہ برطانوی سامراج کی مصلحتوں کو پورا کیا جائے۔ یہ پراپیگنڈہ تحریک پاکستان کے دوران یا قائد اعظمؒ کی زندگی تک ہی محدود نہ تھا اس کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں (جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے) مسلم لیگ کے متعلق رقمطراز ہیں۔

قطری طور پر مسلم لیگ کے لیڈر کانگریس کے مطالبۂ آزادی کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے کسی ایسے مطالبے کی تائید کی تو برٹش گورنمنٹ سرکاری ملازمتوں اور انتخابی اداروں میں مسلمانوں کو مخصوص مراعات نہیں دیگی۔ وہ دراصل کانگریس کو باغیوں کی ایک غیر ذمہ دار جماعت سمجھتے تھے..... مسلم لیگ کا یہ پروگرام برٹش گورنمنٹ کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ درحقیقت ایسا سمجھنے کے کافی قرائن موجود ہیں کہ لیگ برٹش گورنمنٹ کے ایما پر چل رہی تھی۔ (انڈیا ونس فریڈم۔ صفحہ ۱۱۰)

پھر وہ قائد اعظمؒ کی سیاسی عظمت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

اب مسٹر جناح مسلم لیگ کے لیڈر ہو گئے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کانگریس اور برٹش گورنمنٹ کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جب کبھی کانگریس اور گورنمنٹ میں اختیارات منتقل کرنے کی گفت و شنید شروع ہوتی تو پہلے وہ خاموش رہتے۔ اگر گفت و شنید ناکام ہوتی تو وہ ایک گرما گرم بیان دیتے اور دونوں پارٹیوں کی خبر لیتے اور یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ چونکہ کوئی فیصلہ نہیں ہوا اس لئے برطانیہ کی پیشکش پر مسلم لیگ کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں (ایضاً صفحہ ۱۱۱)

ازاں بعد تحریک پاکستان کے متعلق فرماتے ہیں۔

کیبنٹ مشن پلان کے تحت مشترکہ آزاد ہندوستان میں انگریزوں کو ہندوستان کی صنعتی اور اقتصادی زندگی میں دخیل ہونے کا اتنا موقع نہیں مل سکتا تھا جتنا کہ ملک کی تقسیم کی صورت میں جس میں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے آزاد و خود مختار ہونے تھے۔ اور انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کا موقع مل سکتا تھا۔ جس ملک میں مسلم لیگ کی حکومت ہو وہاں انگریزوں کو اپنے مستقل اثر کا واضح امکان حاصل تھا۔ اس سے ہندوستان کا طرز عمل بھی متاثر ہوتا۔ پاکستان میں انگریزوں کی موجودگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندوستان کو انگریزی مفاد کی طرف کہیں زیادہ توجہ دینی پڑتی بہ نسبت دوسری شکل کے (ایضاً صفحہ ۱۹۲)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

یہ سوال عرصے سے دماغوں میں تھا کہ آیا آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ میں رہے گا یا نہیں۔ کیبنٹ مشن پلان کی رُو سے فیصلہ خود ہندوستان پر چھوڑ دیا گیا ہے..... تقسیم ملک کے باعث حالات میں انگریزوں کے حق میں بڑی تبدیلی ہو جائے گی۔ مسلم لیگ کے مطالبہ کے مطابق ایک نئی اسٹیٹ کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ دولت مشترکہ میں رہے۔ اگر پاکستان

> نے یہ فیصلہ کیا تو ہندوستان کے لئے بھی یہ کرنا لازمی ہوگا۔ لیبر گورنمنٹ نے ان عوامل پر خوب غور کیا ہوگا۔ انھوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے کی ضمانت دی تھی لیکن وہ ہرگز یہ بھول نہیں سکتے تھے کہ سیاسی کشمکش میں کانگریس نے ہمیشہ انگریز کی مخالفت اور لیگ نے اس کی امداد کی تھی۔ چنانچہ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کی اسکیم اور قیام پاکستان کا منصوبہ پیش کیا تاکہ مسلم لیگ مطمئن ہو جائے تو لیبر وزارت کے بہت سے ارکان کی طرف سے اس کی تائید ہوئی۔ (ایضاً)

اور اس کے ساتھ ہی چند سطور قبل کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے۔

> لیبر پارٹی نے ہمیشہ کانگریس اور اس کے لیڈروں سے بے حد ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور کئی مرتبہ کھلم کھلا اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ایک رجعت پسند جماعت ہے۔ میرے نزدیک لیبر پارٹی کا مسلم لیگ کے مطالبات کے سامنے ہتھیار ڈال دینا مسلم لیگ کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ برطانوی مفاد کی حفاظت کے لئے تھا۔

حقیقت حال کیا تھی؟

اپنی اہم ذمہ داریوں سے روگردانی اختیار کرتے ہوئے محض ذاتی عناد، جوشِ انتقام اور شکست خوردہ ذہنیت کے زیر اثر مولانا آزاد نے سطور بالا میں جو زہر افشانی کی ہے، اس کی تائید میں کانگریس کی صفوں سے قائداعظمؒ کا کوئی بدترین ہندو دشمن بھی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس مرحلہ پر ہم مولانا آزاد کی ان بہتان طرازیوں کے جواب میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ اس سے کہیں زیادہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ملک کی جنگ آزادی میں قائداعظم مرحوم نے جو انقلاب آفریں کردار پیش کیا اُسے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح قارئین کے سامنے لائیں۔ تحریک استخلاصِ ہند اور تحریک استقلال پاکستان کے سلسلے میں قائداعظمؒ کی معرکہ آرائیوں کی جو تفاصیل بالترتیب قارئین کے سامنے آئیں گی وہ زبانِ حال سے اس حقیقت کی نقاب کشائی کر دیں گی۔ یہی داستانِ جہاد بتلائے گی کہ جس وقت "من چلے جناح" نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے برطانوی سامراج کے ایوانوں میں زلزلہ ڈال رکھا تھا اُس وقت کانگریس کس آستانِ اقتدار کا طواف کر رہی تھی۔ جب یہی "رجعت پسند" جناح لارڈ ریڈنگ اور لارڈ ولنگڈن جیسے نشہ اقتدار کے بدمستوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا رہے تھے اس وقت مولانا کے انگریز دشمن نیتا سرکاری ایوانوں میں عہدِ وفا استوار کر رہے تھے۔ نہیں بلکہ یہی "فرقہ پرست" جناح جب ہندو مسلم اتحاد کو آزادیٔ ہند کا نشان قرار دے کر برادرانِ وطن سے پیامبر اتحاد کا خطاب پا رہے تھے کانگریس کے دہاتما گئو رکھشا کے لئے تلوار اٹھانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ نہیں نہیں! یہی "انگریز دوست" جناح جب دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں بطور احتجاج کمانڈران چیف کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت کو ٹھکرا رہے تھے کانگریسی "ستیہ مورتی" حکومت کو ان کے خلاف برانگیختہ کرنے کا فخر حاصل کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ عین اس وقت جبکہ ایک طرف وائسرائے بہادر کی جنگی کونسل میں شرکت کے جرم کی بنا پر سر سکندر حیات، سر سلطان احمد، مولوی فضل الحق، اور بیگم شاہنواز کے خلاف تعزیری اقدام بروئے کار لائے جا رہے تھے۔ دوسری جانب وار دھا کے سامری، سابرمتی کے کنارے ویسٹ منسٹر ایبے اور پارلیمنٹ ہاؤس پر بمباری کے فرضی تصور کے پردے میں آقایانِ فرنگ کی جنگی پسپائیوں پر ہمدردی اور وفاداری کے آنسو بہا رہے تھے۔ ایک قدم اور آگے بڑھیئے! تاریخ ہمارے سامنے ایک اور

لعنت ہی لاتی ہے اور وہ یہ کہ جس وقت کانگریس کے سبحان ہند کا پورا کنبہ وائسرائگل لاج میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مہمان نوازیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس ایوان میں ملت اسلامیہ اور اس کے مطالبۂ پاکستان کے خلاف جس دور کی سب سے شرمناک سازش کے نقشے ترتیب پا رہے تھے۔ یہی ماؤنٹ بیٹن اپنے سکریٹری کیمبل جانسن سے اس خطرہ کا بھی اظہار کر رہے تھے کہ اگر مسٹر جناح انگریز اور کانگریس کی اس سازش کے بھینٹ چڑھا دیئے گئے تو انہیں "سیاسی شہید" کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ جب قائد اعظم اور مطالبۂ پاکستان کے خلاف اپنی ذلیل ترین سازش کو مکمل کر کے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، مولانا آزاد کو وائسرائگل لاج کے بند کمرے میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے خفیہ راز کو مناسب وقت پر بروئے کار لانے کا منصوبہ تیار کرا رہے تھے عین اسی وقت اسی سازشی انگریز کی مخاصمانہ روش کے خلاف "انگریز کا حامی" جناح مسلم لیگ کونسل پر واضح کر رہا تھا۔۔۔

> میں نے تمام دلائل ختم کر دیئے۔ امداد و اعانت کے لئے کسی دوسرے ذریعہ کی تلاش کا کوئی فائدہ نہیں۔ سوائے ملتِ اسلامیہ کے ہمارے لئے کوئی دوسرا ٹریبونل نہیں جس کی طرف ہم رجوع کریں۔ (رہنمائے ملت)

یہ ہے تاریخ آزادی کے محض چند واقعات کی ایک مختصر اور مدھم سی صدائے بازگشت جن کی روشنی میں متحدہ قومیت کے علمبردار بزرگوں کی الزام بازیوں کی حقیقت پوری طرح الم نشرح ہو کر انصاف پسند دنیا کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ اہم واقعات اس سلسلۂ مضمون کے مناسب مقامات پر پوری تفصیل سے قارئین کے سامنے آئیں گے۔ اور ان کی روشنی میں کانگریس کی آزادی اور حریت کے بلند بانگ دعووں کا جو ڈھول ساری دنیا میں پیٹا گیا ہے، اس کا پول بھی پوری طرح کھل جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ جنگِ آزادی میں قائد اعظم کی معرکہ آرائیوں کے اس باب کی تمہید ہی اس ناگوار الزامی بحث کی زد میں آگئی۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ اشد ضروری ہے کہ دشمنانِ پاکستان نے اپنی بہتان طرازیوں کی تشہیر میں جس پست ترین حد تک جانے میں باک نہیں سمجھا اور اس سے جو مذموم اثرات ذہنوں میں مرتسم ہو سکتے ہیں انہیں قارئین کی نگاہوں سے اوجھل نہ رکھا جائے۔

کانگریس میں داخلہ

آئیے! اب ہم براہِ راست اپنے اہم موضوع کی طرف آتے ہیں۔

جنگِ آزادی کی تاریخ اپنے ابتدائی دور کا نقشہ پوری تفصیل سے ہماری نگاہوں کے سامنے لاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب بڑے ہی دھیمے دھیمے سُروں میں بڑے عجز و انکسار کے ساتھ کہیں کہیں آزادی کا ایک آدھ نغمہ سنائی دے رہا تھا۔ کانگریس کے اجلاس کلکتہ (سنہ ۱۹۰۶ء) کے پلیٹ فارم سے ایک نفاست پسند، خوش پوش اور گرمجوش بیرسٹر ابھرتے ہوئے شباب کا بانکپن اور تند و تیز عزم لے کر میدانِ سیاست میں نمودار ہوا۔ اس کا جچا تُلا اندازِ بیان، دل نشین آواز، دلائل و براہین کی پختگی، پُر اعتماد فکر و نظر۔۔۔ چوٹی کے آزمودہ کار رہنمایانِ ملک نے محسوس کیا کہ بزمِ سیاست ایک نئی اور دلآویز شمع کی لو پاشیوں سے جگمگا اٹھی۔ مسٹر گوکھلے اور دادا بھائی نوروجی جیسے عظیم سیاستدانوں نے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ یہ تھا قائد اعظم محمد علی جناح اور یہ تھی کارزارِ سیاست میں اس حکیم سیاست کے داخلے کی داستان۔

بہت جلد انہوں نے محسوس کیا کہ انکسار و اعتدال کی مصلحت پسندیوں میں ڈھلا ہوا یہ پلیٹ فارم ان کے بے باک نعروں کا متحمل

نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اُس کی لرزہ فگن صداؤں سے ہوم رول لیگ نے پلیٹ فارم کا رخ کر لیا۔ اور اس پلیٹ فارم سے انھوں نے جس جرأت و بے باکی سے امپیریلزم کے لات و منات پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ بمبئی کا جناح میموریل ہال اور اس کی ایک ایک اینٹ آج بھی بیانِ دل اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ قائدِ اعظم کی شرکت سے قبل کانگریس کی حیثیت کیا تھی، اور اس کے قیام کا مقصد کیا؟ یہ جاننے کے لئے پنجاب کے مشہور کانگریسی رہنما ڈاکٹر ستیہ پال کی ایک مشہور تصنیف کے حسب ذیل الفاظ کو سامنے لائیے۔

مسٹر ہیوم نے کانگریس کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان کی بہتری کے لئے نہیں بلکہ برٹش راج کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے۔۔۔۔ مسٹر ہیوم کا کون کتنا ہی مشکور کیوں نہ ہو کہ انھوں نے ایسی تنظیم کی بنا ڈالی جو ایجی ٹیشنوں سے شاہ بلوط کے درخت کی طرح پروان چڑھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر ہندوستانی اس بات کو ملحوظ رکھے کہ اس کی پشت پر ہندوستان کو برٹش حکومت کے جوئے سے آزاد کرانے کا مقصد نہ تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ برٹش حکومت کی جڑیں ہندوستان میں اور مضبوط و مستحکم ہوں۔۔۔ تاجِ برطانیہ سے وفاداری کانگریس کا مذہبی فریضہ تھا اور اس کا تعلیم یافتہ طبقہ برٹش طرزِ حکومت کا دلدادہ تھا۔

(کانگریس کے ساٹھ سال صفحہ ۱۱۰)

چنانچہ اس کے سالانہ اجتماعات میں جو خطبات صدارت پڑھے جاتے تھے، ان میں اس قسم کی یقین دہانی لازماً شامل ہوتی تھی کہ

کیا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کا اجتماع جس کا ہر فرد برٹش حکومت کی نعمتوں سے واقف ہے کسی ایسے مقصد کے لئے منعقد ہو سکتا جو حکومت کے خلاف ہو۔ اس حکومت کے جس نے ہم کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔ ہم کو صاف طور پر یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ ہم سر سے پاؤں تک وفادار ہیں۔

(خطبہ صدارت دادا بھائی نوروجی)

مسلم لیگ میں شرکت

سنہ ۱۹۱۳ء میں قائدِ اعظم مولانا محمد علیؒ اور سید وزیر حسن کی کوششوں سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ اور ہر دو بڑی سیاسی جماعتوں کے ممتاز رہنما کی حیثیت سے ان کی یہ انتھک اور مسلسل جد و جہد بروئے کار آئی کہ ہر دو جماعتوں کے باہمی سمجھوتے سے ہندو مسلم اتحاد کا وہ سنگِ بنیاد قائم ہو جائے جس پر ملک کی آزادی کے ایوان تعمیر ہو سکیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی (دسمبر ۱۹۱۵ء) میں ہم ان کا یہ پیغام سنتے ہیں کہ

ملک کی دو بڑی جماعتوں نے اپنے سامنے جو مشترکہ نصب العین رکھا ہے اس کو حاصل کرنے کے لئے دونوں کی متحدہ جد و جہد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر دونوں جماعتوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر اس نصب العین کے حصول پر غور کریں تو اس میں کونسی حرج کی بات ہے۔ بمبئی کا یہ اجلاس ہماری تنظیم کا ایک زبردست امتحان ہے۔ اجلاس کی کامیابی گویا مسلمانوں کی تنظیم، ان کی وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ علاوہ ازیں ہم اپنے ہندو بھائیوں کو دکھا دیں گے کہ سیاسی میدان میں بھی ہم ان کے ساتھ پہلو بہ پہلو چل سکتے ہیں۔ یہی ایک صورت ہے جس سے ہم حکومت پر دباؤ ڈال سکتے ہیں کہ جس چیز کا ہم مطالبہ کرتے ہیں حقیقتاً ہم اس کے اہل بھی ہیں۔

(قائدِ اعظم محمد علی جناح صفحہ ۹۰)

یہ وہ دور تھا جب برطانیہ عظمیٰ کے جاہ و جلال کا سکہ چاروں طرف بیٹھا ہوا تھا۔ دلوں پر خوف و ہراس کے پہرے تھے اور زبانوں پر

سکوت کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس دور میں اگلے ہی سال انھوں نے بمبئی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس میں اپنے صدارتی خطاب میں اعلان کیا۔

> اس وقت ہمارے سامنے ایک ہی چیز ہے اور وہ یہ کہ سب سے پہلے موجودہ دفتری حکومت سے قوت چھین کر جمہوری حکومت کے سپرد کردیں۔ ہماری ساری توجہ اب اسی مقصد پر مرکوز رہنی چاہیئے۔ حالات اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان متحدہ طور پر اس تبدیلی کو جلد از جلد معرضِ وجود میں لانے کی کوشش کریں...... تیس کروڑ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ آواز میں اتنی قوت ہوگی کہ وہ دنیا کی ہر چیز کا مقابلہ کر سکے گی۔ ہندوستان ایک نئی کروٹ لے رہا ہے۔ ہم صدیوں سے مصائب و آلام سے دوچار چلے آرہے ہیں مگر ہم نے صبر و استقلال سے کام لیا ہے۔ ہمارا شاندار مستقبل اب بہت قریب ہے۔ ہم صراطِ مستقیم پر قدم بڑھا چکے ہیں اور منزلِ مقصود سامنے نظر آرہی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۰۱-۱۰۲)

پیامبرِ اتحاد

سنہ ۱۹۱۶ء میں قائداعظم کی زندگی میں ایک یادگار اور ناقابلِ فراموش مرحلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی سالہا سال کی مسلسل اور انتھک کوششوں کے باعث کانگریس اور مسلم لیگ لکھنؤ میں اکٹھی ہوئیں اور "لکھنؤ پیکٹ" کے نام سے وہ تاریخی سمجھوتہ معرضِ وجود میں آیا جس نے پہلی بار دو بڑی قوموں کو شانہ بشانہ آزادی کی منزل پر گامزن ہونے کا امکان عطا کیا۔ قائداعظم اب پورے ملک کے زعیم تھے۔ اس عظیم کارنامے کا سہرا انہیں کے سر بندھا۔ وہ "سفیرِ اتحاد" اور "پیامبرِ اتحاد" کے خطابات سے نوازے گئے۔ شہرت کے آسمان پر ان کا نام ستارۂ صبح کی طرح جگمگا رہا تھا۔ لکھنؤ کے اس یادگار اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

> زمانہ قدیم میں جس کسی نے جنگ لڑی اور آزادی حاصل کی وہی آزادی کے اہل سمجھے گئے مگر آج کا دور اس زمانے سے مختلف ہے اب فتح و نصرت صلح سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہم صرف آئینی جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ اس جنگ میں ہم ہر ممکن جد و جہد سے کام لیں گے اور ہر قسم کی قربانیاں پیش کریں گے۔ ہم سلطنتِ برطانیہ پر اس حقیقت کو واضح کر دیں گے کہ اس سلطنت میں "ہندوستان" ایک شریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہمارا کم سے کم سیاسی مقام ہوگا...... سیاسی منزل تک پہنچنے کے لئے ہندو مسلم اتحاد ایک مشعلِ راہ ہے۔ ہماری کامیابی کا سارا انحصار دونوں کے خوشگوار اتحاد پر مبنی ہے۔ (ایضاً)

انہی ایام میں بمبئی پریذیڈنسی ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام حکومت کی متشددانہ پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے ایک عظیم الشان اجتماعِ عام ہوا۔ اس اجلاس کی مسندِ صدارت سے بمبئی کے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس بے باک زعیم نے پہلے حکومت کی متشددانہ پالیسی کی وضاحت کی اور پھر فرمایا۔

> سمجھ میں نہیں آتا کہ پوری سلطنتِ برطانیہ میں صرف ہندوستان سے یہ سلوک کیوں روا رکھا جا رہا ہے۔ ہندوستان نے جنگِ عظیم میں جان و مال کی قربانیاں دی ہیں اور سلطنت کا تحفظ کیا ہے۔ یہ جنگ مختلف ملکوں کی آزادی و استقلال کی بقا کے لئے لڑی جا رہی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا اربابِ حکومت فاتر العقل تھے؟ کہ انھوں نے وفادار ہندوستانیوں سے یہ

سلوک روا رکھا۔ حکومت کا یہ طرز عمل ان کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔ ہز ایکسی لینسی لارڈ چیمسفورڈ اس وقت کیا کر رہے تھے۔ ایسی فضا میں ان کی خاموشی نہ صرف منحوس تھی بلکہ صوبائی حکومتوں کی متشددانہ پالیسی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔

(ایضاً)

مہاتما جی کا نیا روپ

عین اس وقت جبکہ قائد اعظمؒ کی شبانہ روز جد و جہد کی بدولت کانگریس اور مسلم لیگ نے باہمی اتحاد کی خوشگوار فضا میں آگے بڑھنا شروع کیا مہاتما ملک کی گئورکھشا کے نام پر بھڑکائی ہوئی آگ جو کچھ مدت سے سرد پڑ چکی تھی ایک بار پھر شعلہ زن ہو گئی۔ اور حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس راکھ کو از سر نو ہندو مسلم فساد کے شعلوں کی صورت میں بھڑکانے والے ہاتھ کسی فرقہ پرست ہندو مہاسبھائی کے ہاتھ نہیں تھے بلکہ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ شرف مہاتما گاندھی کے مقدس ہاتھوں کو حاصل ہو رہا تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے جریدہ اسٹیٹسمین کو وہ مشہور خط لکھا جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

> میں جانتا ہوں کہ ہندوؤں کا غصہ اس وقت انگریزی راج کی دھاک میں دبا ہوا ہے مگر ملک بھر میں کوئی بھی ایسا ہندو نہیں جو اس بات کا متمنی نہیں ہے کہ اس ملک کو ایک دن گئو کشی سے پاک کرنا ہو گا۔ گو یہ چیز ہندو دھرم کے خلاف ہے مگر اس معاملہ میں ہندو تشدد سے کام لے گا۔ اور عیسائیوں اور مسلمانوں کو تلوار کے زور پر گئو کشی ترک کرنے پر مجبور کرے گا۔

مہاتما جی کے اس اعلان سے ہندو مسلم فسادات کی آگ کو جو ہوا دی۔ اس کی تفصیل تاریخ کا ایک مستقل ورق ہے اور اس سے وہ تمام نقاب الٹ جاتے ہیں جو اہنسا، پریم اور شانتی کے دلفریب الفاظ سے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

ایک طرف مہاتما جی یہ کھیل کھیل رہے تھے اور آزادی کی جس منزل کے بارے میں قائد اعظمؒ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ امید دلائی تھی کہ وہ سامنے نظر آ رہی ہے اُسے نگاہوں سے اوجھل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور دوسری طرف یہ "سفیرِ اتحاد" جنگی کانفرنس کے اجلاس (منعقدہ ۱۹۱۸ء) میں وائسرائے بہادر کے سامنے یہ دو ٹوک اعلان کر رہا تھا کہ جب تک ہندوستانیوں کی سیاسی آزادی کا تقاضا انہیں پوری طرح سمجھایا نہیں جائے گا اس وقت تک وہ جنگی مساعی میں شریک کار بننے سے اجتناب کریں گے۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دلی کی اسی جنگی کانفرنس کے سلسلے میں جہاں قائد اعظمؒ نے مذکورہ اعلان کیا وہاں گاندھی جی نے اپنے ایک انگریز دوست کی وساطت سے وائسرائے کو ایک خط بھیجا۔ اور اس خط میں انہوں نے تحریر فرمایا۔

> میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ اپنے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیں۔ میں کانگریس کو تمام ریزولیوشنز واپس لینے کا مشورہ دوں گا۔ اور دورانِ جنگ میں ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ ہندوستان کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی حمایت پر کٹ مرے۔ (حیاتِ محمد علی)

آئینِ جوانمرداں

ایک طرف کانگریس کے یہ سب سے بڑے راہنما پرائیویٹ چٹھیوں میں وفاداری اور سرکار پرستی کا یہ کھیل کھیل رہے تھے اور دوسری طرف دہلی کی مرکزی اور بمبئی کی پراونشل جنگی کانفرنسوں میں قائد اعظمؒ کی وہ گرج سنائی دے رہی تھی جس نے سامراج کے ایوانوں میں تہلکہ ڈال رکھا تھا۔ اشاعتِ ماسبق میں یہ تفصیل سامنے آ چکی ہے کہ بمبئی کے مغرور اور [illegible]

گورنر لارڈ ویلنگڈن جو ہندوستانیوں کی توہین و تذلیل میں بڑا سرگرم تھا۔ قائد اعظم نے بمبئی کے جلسہ عام میں کس بے باکی سے چھٹی کا دودھ یاد دلایا تھا۔ لارڈ ویلنگڈن کے بعد لارڈ برابورن بمبئی کا گورنر مقرر ہوا جو غرور اور اکڑ بازی کے لحاظ سے لارڈ ویلنگڈن سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس نے مسلم لیگ کے بمبئی کے سالانہ اجلاس میں تو خیر خون رونے کے ذریعے گڑبڑ پیدا کرنے کی بد دماغی اور سازشی کردار کی ایک نئی اور شرم انگیز مثال قائم کر دی تھی۔ چنانچہ اس پر غرور روش اور غیر ذمہ دارانہ حرکات کے ساتھ ہی قائد اعظم سے اس کی چپقلش کا آغاز ہو گیا۔ ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے قائد اعظم نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اسی دوران میں یکم جون ۱۹۱۸ء کو لارڈ ولنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا۔ قائد اعظم بھی اس اجلاس میں ہوم رول لیگ کے قائد کی حیثیت سے موجود تھے۔ جنگ عظیم کا دور دورہ تھا۔ ہنگامی اور متشددانہ قوانین نے چاروں طرف خوف و ہراس کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ اور اس وحشت انگیز دور میں ادنیٰ سی جرأتمندانہ حرکت بدترین خطرے کی دعوت تھی۔

یہ تھا وہ ہیبت ناک ماحول جس میں لارڈ ولنگڈن نے اپنے صدارتی خطاب کا آغاز کیا تھا۔ خطاب کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبر و رعونت اور وحشت و بربریت کا کوئی مغرور دیو غیظ و غضب کی آگ سینے میں لئے لب کشائی پر اتر آیا۔ آغاز تقریر ہی اس نے زہریلے انداز میں ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کی نیت پر حملہ کیا۔ کچھ دھمکیاں دیں۔ کچھ ڈانٹ پلائی۔ اور جب یہ یقین ہو گیا کہ اپنی ہیبت کا سکہ پوری طرح بٹھا لیا اور اب کوئی پر نہیں مار سکتا تو تقریر ختم کرتے ہی فی الفور قائد اعظم کو تقریر کی دعوت دی۔ یہ تھا ایک مسافر انقلاب کی آزمائش کا کڑا مرحلہ۔ قائد اعظم تقریر کے لئے اٹھے۔ اپنی مخصوص شان بے نیازی اور مجاہدانہ وقار کے ساتھ اسٹیج پر پہنچے اور بلا خوف لومۃ لائم اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔

> ہر حکومت ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیئے قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ ہز ایکسیلنسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرز کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے اور ہز ایکسیلنسی کے احترام کے باوجود میں اس طرز عمل کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ہم دونوں میں۔ ہمارے نزدیک جرمن خطرہ سپاہی دور نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے ...... ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریک کار نہ بنایا جائے۔ (جناح محمد علی)

جون ۱۹۱۸ء میں لارڈ ولنگڈن سے یہ جھڑپ ہوئی اور چھ ماہ بعد ۱۱ر دسمبر کو لارڈ موصوف سے وہ تاریخی ٹکراؤ منظر عام پر آیا جس میں قائد اعظم کے مظاہرۂ حریت نے پورے ملک سے خراج تحسین وصول کیا۔ تحسین و آفرین کے والہانہ جوش میں بمبئی کے لاکھوں شہری انہیں "پیامبر اتحاد" کے خطاب سے یاد کر رہے تھے اور جناح میموریل ہال کی تعمیر اس مظاہرۂ عقیدت کی عملی تشکیل میں منظر عام پر آ رہی تھی۔

اس معرکہ آرائی کی تفصیل سابقہ اشاعت میں بیان کی جا چکی ہے۔ اس تاریخی مرحلہ پر ہم قائد اعظم کے عوام کے نام اس یادگار پیغام کو ایک بار پھر دہراتے ہیں ــــ

آپ کی مساعی جمیلہ نے یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دی کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی مل کر بھی آپ کو خوف زدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۹ دسمبر کا دن بمبئی کی تاریخ میں جشن کا دن ہے۔ جایئے اور خوشیاں منایئے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔ (ایضاً)

"جناح میموریل" کے قیام کے سلسلے میں اس فاتحانہ مرحلہ پر "بمبئی کرانیکل" میں مسٹر پی۔ ڈی لام کی جو اپیل شائع ہوئی اس کے یہ الفاظ بمبئی کے لاکھوں شہریوں کے دلوں کی آواز تھے ــــ

کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں۔ ان کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناح کے عزم صمیم میں ہمارے مرحوم لیڈروں دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ... انھوں نے عوام کے حقوق کی رہنمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محب وطن کی حیثیت سے ان کا نام ہمیشہ ہمارے دلوں میں تر و تازہ رہے گا۔ ... مسٹر جناح ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ (حیات محمد علی)

قائد اعظم کے یہی زندہ جاوید معرکے تھے جن کا اعتراف کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کو بھی "ہریجن" کی ۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں یہ لکھنا پڑا ــــ

مسلم لیگ ایک عظیم المرتبت آرگنائزیشن ہے اس کا صدر (قائد اعظم) ایک وقت میں کانگریس کا پرجوش حامی تھا اور اس سے ہماری بہترین امیدیں وابستہ تھیں۔ لارڈ لنلتھگو سے اس کی معرکہ آرائیاں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

لارڈ لنلتھگو سے نبرد آزمائی کا دور ابھی بمشکل ختم ہوتا ہے کہ ابتلاء و آزمائش کی ایک نئی اور کٹھن منزل کاروان حریت کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ منزل تھی ہنگامی اور متشددانہ قوانین کے سلسلے میں رولٹ ایکٹ جیسے دوسرے عام مسیاہ قانون کا نفاذ۔ یہ ایکٹ اپنی ہمہ گیر ظالمانہ گرفت کے لحاظ سے ملک کے ہر محب وطن اور آزادی پسند گوشے کے لئے ایک نادر چیلنج سے کم نہ تھا۔ پورا ملک اس ایکٹ کی گھناؤنی جزئیات کے خلاف سراپا احتجاج نظر آتا تھا۔ قائد اعظم نے عوام کی دھڑکنوں کو بجا طور پر محسوس کیا۔ وہ ان کی نمائندگی کے لئے مردانہ وار آگے بڑھے اور امپیریل کونسل میں ان کے نعرۂ حق کی صدائے بازگشت وائٹ ہال تک سنائی دی انھوں نے کہا ــــ

سارے معاملہ کو ایک ایسی مخصوص روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے اچانک ہم میں سے کوئی جرائم پیشہ قبائل اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ اور عظیم خطرات کا پیش خیمہ بن گئے ہوں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ بلا سوچے سمجھے اس سلسلے میں ہر شخص نے قانون سازی کو اپنا فرض اولین قرار دے لیا ہو اور رجسٹر قوانین میں اس کا اندراج کرنے کے بعد اس مسئلہ کو حل کر لیا ہو۔ میں آپ کو

بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ خواہ کتنے ہی قوانین وضع کر کے رجسٹر قوانین میں درج کر لیں وہ اس مسئلہ کا حل ثابت نہیں ہو سکتے۔ ان دشواریوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے آپ کو کافی حد تک اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑے گی۔

(قائدِ اعظم محمد علی جناح)

اس تقریر کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور کونسل سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وائسرائے بہادر کے نام انکا اہم خط ہماری جنگِ آزادی کی ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خط میں انھوں نے لکھا ـــــ

حکومتِ ہند نے اور آپ نے ازراہ امن میں ایک ایسی چیز کو رجسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً نفرت انگیز اور بلا خوف تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگی کانفرنس میں مدد کے لئے ہندستانیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے روند دیا ہے جن کے لئے حکومتِ برطانیہ نے جنگ لڑی تھی۔

انصاف کے بنیادی اصولوں کا خون اس وقت استعمال کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ....

ان حالات کے درمیان میں اپنے رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضو معطل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ بریں ایک ایسے شخص کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو تعاون کرنا امر محال ہے۔

میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانہ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے۔ مہذب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

قائدِ اعظم جیسے دور اندیش حکیم سیاست کا استعفیٰ عوام کے ہیجان و اضطراب اور غیظ و غضب کا ترجمان تھا۔ اس ہیجان و اضطراب نے مظاہروں کی صورت اختیار کر لی۔ جلسوں اور جلوسوں کا ملک گیر سلسلہ شروع ہو گیا۔ جنگِ عظیم کی فتح کے نشے میں بدمست ہو کر حکومت کے کارفرما وحشت و بربریت کے مظہر بن کر میدان میں نکل آئے اور جن عوام کی قربانیوں سے جنگِ عظیم کی شکست سے فتح کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تھا انہی کے خلاف مشین گنوں کے منہ کھول دیئے اور ساتھ ہی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار سے فضا میں ایک تہلکہ سا بپا کر دیا۔ جلیانوالہ باغ کا اندوہناک حادثہ اسی ظلم اور بربریت کا شاہکار ہے جہاں دیکھتے ہی دیکھتے جنرل ڈائر کی درندگی نے سینکڑوں بے گناہوں کو خاک و خون میں تڑپا کر رکھ دیا۔ برطانوی سامراج کی وحشت و درندگی کے اس جگر پاش اقدام نے پورے ملک کی فضا میں غیظ و غضب کی بجلیاں دوڑا دیں۔ قائدِ اعظم جو پہلے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف تلملائے بیٹھے تھے غم و غصہ کے عالم میں جیخ اٹھے۔ ملک کے طول و عرض میں ان کی یہ گرج سنائی دی ـــــ

رسوائے عالم صدر رولٹ کمیٹی کے "شاہکار" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی

انہیں دھو سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں تو کل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم یہ بیانات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرز حکومت ناقابل برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دارانہ حکومت ہونی چاہئے اس سلسلہ میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس زیادہ موثر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولیوشن بھیجنے کے بجائے کوئی موثر لائحہ عمل وضع کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں بروئے کار لائے گئے۔

(قائد اعظم محمد علی جناح)

خراج تحسین

قومی زندگی کے انتہائی نازک مرحلوں اور وحشت ناک فضا میں قائد اعظم کی حق گوئی و بے باکی کی یہ جرأت آفریں داستان تاریخ آزادی کا ایک درخشندہ باب ہے۔ ان کے یہ نعرہ ہائے حریت کسی جذباتی اور ہنگام پسند طالع آزما کی آتش بیانیوں کے مترادف نہیں بلکہ یہ ایک دور اندیش اور حقیقت پسند حکیم سیاست کی صدائے حق تھی جس نے ملک و ملت کی نمائندگی اور قیادت کا فریضہ شایان شان جرأت سے ادا کیا۔ ان کے تدبر اور فراست کے یہی وہ بے مثال شاہکار تھے جنہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے گوپال کرشن گوکھلے جیسے عظیم رہنما نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ

ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی وہ جناح ہی کے دماغ کی بدولت ہوگی۔ (حیات محمد علی)

اس دوران میں ایسے مرحلے بھی آئے جبکہ حکومت برطانیہ نے انہیں مختلف ذرائع سے خریدنے کی کوشش کی۔ (یہ بجائے خود ایک قابل ذکر داستان ہے لیکن مضمون کی طوالت کے پیش نظر ہم اس سے متعلقہ واقعات کی تفصیل سے گریز اختیار کر رہے ہیں) ان کی اسی رفعت کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسز سروجنی نائیڈو نے برملا اعتراف کیا تھا کہ

میں بڑی مدت سے مسٹر جناح کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے لیکن میں یہ پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کو کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

(MY LEADER — AIZA. SALEHRI)

رولٹ ایکٹ جیسے متشددانہ قوانین کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ کی فائرنگ جیسے دلدوز حادثات نے ملک کی داخلی سیاسیات میں غم و غصہ کی آگ سی بھڑکا رکھی تھی کہ خلافت ترکیہ کے خاتمہ نے ہیجان و اضطراب کا ایک نیا طوفان بپا کر دیا۔ ترکی جنگ عظیم میں شکست کھا چکا تھا اور اس کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے ان تمام وعدوں کو پاؤں تلے روند دیا جو اسلامیان ہند سے کئے گئے تھے۔ خلافت کی تباہی اور ترکی پر اتحادیوں کے قبضے نے یہاں کے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑک دیا اور ان کے اس اضطراب نے تحریک خلافت کا رنگ اختیار کرتے ہوئے ملک کے طول و عرض میں جوش و خروش کے ہنگامے برپا کر دیئے۔ اسلامیان ہند اور ان کے گرجوش لیڈر تحریک خلافت اور تحریک ہجرت کے جوش میں اس قدر آپے سے باہر ہو گئے کہ انہیں دوست اور دشمن میں امتیاز کرنے کی سدھ بدھ نہ رہی۔

گاندھی جی

تاریخ کے اس ہنگامہ خیز اور نازک مرحلے میں گاندھی جی اسلام اور مسلمانوں کی ہمدردی کا نقاب اوڑھ کر آگے بڑھے۔

اور اپنی ساحرانہ اداؤں سے اس پوری تحریک کو اپنے دامِ تزویر میں سمیٹ لیا اور اس کے بعد تحریک خلافت کے سرپرست بن کر عدم تشدد اور ترکِ موالات کے ایسے ایسے دلکش جام گردش میں لائے، کہ سرپھرا اور گرمجوش مسلمان اپنے لیڈروں سمیت تیرہ سو برس کی تاریخ کو بھول گیا۔ اہنسا اور ستیہ گرہ کی میٹھی میٹھی لوریوں میں اس نے ایسے ایسے سہانے خواب دیکھنے شروع کر دیئے کہ بدر و حنین اور قادسیہ و یرموک کے جہاں آرا واقعات اور ان کی روح بھلا سے بیگانگی اختیار کر لی۔ تحریک خلافت اور نیشنل کانگریس اب پوری طرح گاندھی جی کے اشاروں پر رقص کر رہی تھیں۔ اور آزادی کے حصول کے لیئے قومی جد و جہد کا قافلہ ایک نئی اور عجیب و غریب منزل پر قدم بڑھا رہا تھا۔

برقت انتباہ قائد اعظم نے عوام کو اس دامِ فریب سے خبردار کرنے کی پوری کوشش کی اور جب یہ جادو نہ ٹوٹ سکا تو ایک سچے اصول پسند کی طرح وہ دامن جھاڑ کر کانگریس سے الگ ہو گئے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے مسلسل پندرہ برس تک ہندو مسلم اتحاد کے سہارے آزادی کی منزل تک پہنچنے کا انتھک مدعی اب سیاست کی ہنگامی شعبدہ بازیوں سے دامن کشاں ہو گیا تھا لیکن آزادی کی تڑپ اور خلش اُسے اب بھی بدستور طلسم پیچ و تاب بنائے ہوئے تھی۔ ذہنی کشمکش کے اسی مرحلے پر انھیں ۱۹ فروری سنہ ۱۹۲۱ء کو سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی بمبئی کے پلیٹ فارم سے اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ تاریخ نے ان کی اس تقریر کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس تقریر کے دوران انہوں نے انتہائی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے فرمایا ـــ

> مجھے خواہش کی گئی ہے کہ موجودہ نازک صورتِ حال کے پیش نظر میں اپنی خاموشی کی وجہ بیان کروں۔ میں جانتا ہوں کہ موجودہ سیاسی حالت بلاشبہ پُرخطر ہے۔ ایک طرف ہماری حکومت ہے جو مدت سے اعلانیہ طور پر ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہے جس سے ہندوستانیوں کی خودداری کو زبردست صدمہ پہنچا ہے۔ میرے خیال میں ہر اس شخص نے جسے ذرا بھی سیاسی بصیرت حاصل ہے حکومت کی پالیسی کی مذمت کی ہے۔ جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے خون بہایا اور اپنی دولت قربان کی۔ مگر صلح کے بعد انھیں جو انعام ملا وہ رولٹ بل تھا۔ (بمبئی کرانیکل ـــ ۲۰ فروری سنہ ۱۹۲۱ء)

اور پھر اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

> میں نے کئی مرتبہ اپنے آپ سے یہ سوال کیا ہے کہ ایسی حالت میں آخر کیا کرنا چاہیئے؟ میں پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس پر کامل یقین ہے کہ گاندھی جی کا گو میں بہت مداح ہوں اور میرے دل میں ان کا بہت احترام ہے مگر ان کا پروگرام آپ کو غلط راستے کی طرف لے جا رہا ہے ..... میرے خیال میں آپ کا نقطہ نظر محض سیاسی تحریک ہے جس کی بنیاد ان سیاسی اصولوں پر ہے جس کی آگ مادرِ وطن کے سینے میں سلگ رہی ہے۔ جب تک اس تحریک کی بنیاد ان اصولوں پر نہیں رکھی جائے گی، یہ پروگرام میں سقم باقی رہے گا۔ (ایضاً)

اس کے بعد انہوں نے ایک مردِ مومن کی حیثیت سے اپنا موقف پیش کیا اور فرمایا۔

> حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے کسی ملک کے لئے سب سے مقدم چیز فوجی طاقت کا جمع کرنا ہے۔ جرمنی نے میدان جنگ میں آنے سے پہلے چالیس سال تک فوجی تیاری کی۔ ہندوستان میں آخر کونسی فوجی تیاری کی گئی؟ اور کونسی فوجی طاقت

ہلوے پاس ہے۔ گاندھی جی نوجوانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اسکولوں اور کالجوں سے نکل کر دیہات میں پھیل جائیں۔ آخر کس لئے۔۔۔ ترکِ موالات اور عدمِ تشدد کے نظریات سے اگر آپ کامیاب ہوگئے تو یہ ایک معجزہ ہوگا۔ (ایضاً)

دامِ فریب کا شکار

قائدِ اعظم کی اس بروقت حقیقت کشائی سے بھی جوشیلے مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھل سکیں۔ غیور مولانا قوم اسی جوش و خروش میں جبر و تشدد کی بھٹیوں میں بھسم ہو کر رہ گئی۔ علی برادران کی معیت میں گاندھی جی اسلامیانِ ہند کے واحد تعلیمی مرکز علی گڑھ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے آگے بڑھے اور اسے تہ و بالا کرنے میں پوری قوت صرف کردی۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت کو بھی دینے دامن میں محفوظ رکھے ہوئے ہیں کہ عین اس وقت جبکہ مسلمانوں کے یہ ہمدرد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ملیامیٹ کرنے کی سازش بروئے کار لارہے تھے اُن کے اپنے دستِ راست، پوجیہ باپو پنڈت مالوی جی بنارس ہندو یونیورسٹی میں پرنس آف ویلز کے خیر مقدم کی تیاریوں میں دن رات ایک کر رہے تھے اور کسی نے نہ تا حال یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ پنڈت مالوی جی اور بنارس یونیورسٹی سنیہ گرہ کے مجوزہ پروگرام سے کس مصلحت کی بنا پر الگ رکھے گئے ہیں۔

قائدِ اعظم کی پیشگوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ گاندھی جی کو انتہائی ناکامی سے اپنی تحریک واپس لینی پڑی۔ ان کے اس اعترافِ شکست سے ہندوؤں کو تو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا لیکن مسلمانوں کو اپنی گرمجوشیوں کی کافی سزا بھگتنی پڑی۔ موپلا بغاوت، تحریکِ ہجرت اور تحریکِ خلافت کے عظیم جانی و مالی نقصانات نے مسلمانوں کی توانائیاں مضمحل کرکے رکھ دیں۔ ان کی اجتماعی قوتِ عمل شل ہو کر رہ گئی۔ قائدِ اعظم نے یہ سب کچھ دیکھا۔ قوم نے ان کی پکار کو نہ سنا اور جذباتی سیاست کا شکار ہو کر رہ گئی۔ قائدِ اعظم اب کانگریس سے الگ ہو چکے تھے۔ اہنسا اور ستیہ گرہ کی تحریکوں کا انجام ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور (منعقدہ ۱۹۲۴ء) کے خطبہ صدارت میں انھوں نے ایک بار پھر ملک کو مخاطب کیا۔ انھوں نے نہ تو گاندھی جی کی شکست پر کوئی ادنیٰ طنز کی، نہ اپنی ملت سے شکوہ و شکایت کی کوئی ضرورت محسوس کی۔ ان کا پورا خطبہ متانت، سنجیدگی، فرض شناسی اور حسنِ تدبر کا شاہکار تھا۔ سب سے پہلے انھوں نے گذشتہ صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور پھر فرمایا۔

> آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ اس وقت ہمیں پچھلے حالات کا فائدہ اٹھانا چاہیئے اور بُری باتوں کو بھول جانا چاہیئے۔ گذرے ہوئے واقعات کی روشنی میں آئندہ لائحہ عمل وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پیشتر ہم سے لاتعداد غلطیاں سرزد ہو چکی ہیں اور ان کے باعث ہم کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ مگر ان لغزشوں سے بہت سی مفید باتیں بھی معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ ان تین سال کی جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے سامنے سوراج حاصل کرنے کے لئے ایک وسیع میدان ہے۔ عوام میں سیاسی شعور پیدا ہو چکا ہے اور ہر شخص کو احساس ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کی خودداری اور عزتِ نفس اس امر کی متقضی ہے کہ اس ملک کی حکومت ان کے اپنے ہاتھوں میں ہو اور کسی صورت میں غیر ملکیوں کے ہاتھ میں نہ رہے۔

اور پھر کانگریس کے اس "دانا دشمن" نے واضح کیا۔

> سوراج حاصل کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز ہندو مسلم اتحاد ہے۔۔۔ اگر ہم آزادی کے خواہاں ہیں تو آئیے سب متحد

ہو سکتا ہے۔

(تقاریرِ جناح)

کانگریس سے اختلاف اور علیحدگی کے باوجود قائد اعظم کا جہادِ آزادی میں وہ بلند مقام تھا جس سے ان کا بڑے سے بڑا انصاف پسند دشمن بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکا۔ چنانچہ جب مرکزی کونسل کے انتخابات کے مرحلہ پر کانگریس ان کے مقابلہ پر آئی تو بمبئی کرانیکل جیسا نیشنلسٹ آرگن بھی اپنے سیاسی اختلافات بالائے طاق رکھ کر ان کی حمایت میں سرگرم کار ہو گیا۔ ووٹروں سے قائد اعظم کے حق میں اپیل کرتے ہوئے اس کی یہ شہادت ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہے گی۔

> ان کی گزشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبہ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں جناح کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شرکاء کے مقابلہ میں انھیں بہت امتیازی مقام عطا کر دیا ہے

اور پھر اس کا یہ انتباہ کیسا لازوال خراجِ تحسین ہے کہ

> اگر معمولی اختلافات کی بنا پر جناح جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہوگا۔

(قائد اعظم محمد علی جناح)

سائمن کمیشن کا تقرر

سیاسی اصلاحات کے پرزور عوامی مطالبے کے پیشِ نظر جس کی وضاحت میں قائد اعظم نے ایک رائل کمیشن کے قیام پر زور دیا تھا، بالآخر حکومتِ برطانیہ حرکت میں آئی۔ اور سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ برکن ہیڈ نے ۱۹۲۷ء کے اواخر میں سر جان سائمن کی قیادت میں ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ ملک کی بدنصیبی اور آقایانِ فرنگ کی شانِ بے نیازی کا نتیجہ سمجھئے کہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی نمائندے کی شرکت کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ قومی نمائندگی کی یہ ناقابلِ برداشت توہین تھی جس کے خلاف پورا ملک سراپا صدائے احتجاج بن گیا اور اوائل ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن یہاں پہنچا تو جگہ جگہ اس کے خلاف نہ صرف کالی جھنڈیوں اور ہڑتالوں کے پرجوش مظاہرے کئے گئے بلکہ ہر قابلِ ذکر سیاسی جماعت نے اس کا پورا پورا مقاطعہ کیا۔ قائد اعظمؒ اس میدان میں پیش پیش تھے۔ مرکزی اسمبلی میں انھوں نے حکومت کی اس پالیسی پر بھرپور احتجاج کیا اور اراکینِ اسمبلی کی اکثریت کی تائید حاصل کر کے کمیشن کے ساتھ تعاون کی پیشکش مسترد کر دی۔ اور اس طرح پارلیمانی طریق سے کمیشن پر عدمِ اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے دنیا کے سامنے اس کی غیر نمائندہ حیثیت واضح کر دی۔ انھوں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ سلطنتِ برطانیہ کے نمائندوں پر کمیشن کی ناکارہ پوزیشن واضح کرنے کے لئے انھوں نے انگلستان کا سفر بھی اختیار کیا اور وہاں پہنچ کر سب پر یہ حقیقت واضح کی کہ پورا ملک سائمن کمیشن سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ ان نتیجہ خیز مساعی کا نتیجہ تھا کہ کمیشن کو بدترین ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور حکومتِ برطانیہ کے کارفرماؤں پر واضح ہو گیا کہ جب تک ہندوستان کو کما حقہٗ نمائندگی کے مواقع عطا نہیں کئے جائیں گے آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں ہندوستان کا تعاون حاصل کرنا ممکن نہ ہو گا۔ سائمن کمیشن کی ناکامی کے بعد راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا آغاز حکومتِ برطانیہ کے اسی احساسِ شکست کا ردِ عمل تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کی مساعی جمیلہ کا نیا دور

ان مذکورہ کانفرنسوں سے قبل قائد اعظمؒ نے ازسرنو ایک نئے عزم کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک متحدہ نصب العین پر لانے کی کوشش کی۔ ان کے مشہور "چودہ نکات" اسی سلسلہ دراز کی ایک بنیادی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے مئی ۱۹۲۸ء میں بمبئی کے مقام پر آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ پھر ماہ اگست میں لکھنؤ میں ایک دوسری کانفرنس منعقد ہوئی اور ازاں بعد دسمبر میں آل پارٹیز کنونشن کے نام پر کلکتہ میں ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کا اہم اجتماع ہوا۔ قائد اعظمؒ نے ان کانفرنسوں کی کامیابی کے لئے خون پسینہ ایک کر دیا لیکن مہاسبھائی لیڈروں کی منافرت انگیز روش اور متعصبانہ ذہنیت نے ہر موقع پر ملکی اتحاد کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ قائد اعظمؒ کے چودہ نکات مسترد کر دیئے گئے اور اس کے مقابلہ میں نہرو رپورٹ کو لایا گیا۔ جس میں نہ تو مسلمانوں کے مطالبات کو کوئی اہمیت دی گئی اور نہ اکثریت کی دستبرد سے ان کے حقوق کے تحفظ کی کوئی ضمانت موجود تھی۔ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے کا کوئی سامان کیا جاتا۔ مہاسبھائی عنصر نے ان کانفرنسوں میں اپنی اکثریت کی مطلق العنانی کا وہ نقشہ پیش کیا جس سے مسلمان ہمیشہ کے لئے بدظن ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ ہندو لیڈر خواہ کتنی ہی دلفریب نقاب اوڑھ کر سامنے کیوں نہ آئیں ان کی مہاسبھائی ذہنیت کسی مرحلہ پر بھی رواداری اور عدل و انصاف کی تحریک قبول نہیں کرے گی۔

آخری کوشش اور اس کا انجام

ان کانفرنسوں کی ناکامی نے اکثر مسلمان رہنماؤں کو بددل کر دیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہندو کبھی فراخدلی سے ان کی دوستی کو خوش آمدید نہیں کہہ سکیں گے لیکن قائد اعظمؒ کا عزم صمیم اب بھی اپنی مساعی میں شکست قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔ گول میز کانفرنس ان کے لئے امید کی آخری کرن تھی۔ اور لندن میں انہوں نے جان توڑ جدوجہد کی کہ ہندوستان کے نمائندے بلند نگہی اور وسعت قلبی سے کام لیں اور حکومت برطانیہ کے سامنے پورے ملک کی طرف سے ایک متفقہ مطالبہ پیش کر دیا جائے۔ لیکن مہاسبھائی لیڈران کی اس امید کو پورا کرنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوئے اور اس کانفرنس کے دوران انہوں نے مفاہمت کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔

۱۹۰۶ء میں قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ اور کانگریس کے باہمی سمجھوتے کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس کی مسلسل کوششوں میں اب پچیس برس پورے ہو رہے تھے ان کی اخلاص بھری اپیلوں کو بار بار ٹھکرایا گیا۔ ان کی ہر مخلصانہ کوشش پر پانی پھیر دیا گیا۔ بڑے بڑے لیڈر عالم حیرت میں یہ کہتے سنائی دیئے کہ جناح ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں سے کبھی بیزار نہیں ہوتے لیکن ایک دن صبر کا یہ پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور گول میز کانفرنس میں جو کچھ ہوا اس سے ان کا دل ٹوٹ گیا۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔

> گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا۔ خطرہ نمودار ہوتے ہی ہندو دل و دماغ، ہندو جذبات اور ہندو روش ایسی صورت اختیار کر گئے کہ بالآخر اتحاد کی توقع ہی اٹھ گئی۔

پچیس سال کے تلخ تجربوں کا یاس انگیز اور حوصلہ شکن انجام نگاہوں کے سامنے تھا۔ قائد اعظمؒ کی زندگی کا بہترین زمانہ ہندو مسلم اتحاد

کی اس شبانہ روز جدوجہد پر قربان ہوگیا۔ لیکن لندن کانفرنس نے حقیقت حال کے تمام گوشے بے نقاب کر کے رکھ دیئے۔ ان کے دل و دماغ اور فکر و بصیرت نے برملا شہادت دی کہ ہندو مسلم اتحاد ایک سراب ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ ایک سہانا خواب ہے جس کی تعبیر ہمیشہ گھناؤنی اور دلخراش ثابت ہوئی۔ یہ ان کی زندگی کا آخری تجربہ تھا۔ ان کے قدموں نے اس راہ میں مزید ایک قدم آگے بڑھنے سے بھی انکار کر دیا۔

لندن کانفرنس کے ڈراپ سین کے ساتھ قائداعظم کی "تحریک استخلاص ہند" کی جدوجہد کا پہلا باب اختتام پذیر ہوتا ہے چار سال بعد وہ ایک نیا عزم لے کر میدان میں آتے ہیں۔ اور اپنی اور صرف اپنی ملت کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی انھوں نے کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جس میں ہندوؤں سے بے انصافی یا انتقام کی خفیف سی جھلک پائی جاتی ہو۔ ہندو مسلم اتحاد اب بھی ان کے پیش نظر تھا لیکن یہ وہ اتحاد تھا جو دو برابر کی ہمسایہ مملکتوں میں ہوتا ہے۔ یہی اتحاد درحقیقت پائیدار ثابت ہو سکتا تھا دوسرے یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی اس نئی تحریک میں کسی ایسی چیز کو ابھرنے نہیں دیا جس سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو ٹھیس لگے یا جس سے انگریز فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو کس دے۔ ان کی یہ نئی تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے آزادی اور استقلال کی واضح نشان دہی تھی۔ اور تاریخ نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ برطانوی سامراج کے خلاف ان کی یہ نئی منزل "تحریک استقلال پاکستان" کی منزل ہے۔ یہاں سے ان کی جدوجہد کا وہ نیا باب شروع ہوتا ہے جو حصول پاکستان کی فتح عظیم سے حاصل تکمیل کو پہنچتا ہے ہم نے حکومت برطانیہ کے خلاف ان کے جہاد آزادی کا ایک باب قارئین کے سامنے پیش کر دیا اس کا دوسرا باب تحریک پاکستان کے ضمن میں سامنے آئے گا۔

اس اشاعت میں ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قائداعظم پر انگریز نوازی اور رجعت پسندی کے جو الزامات مخالف کیمپ کی طرف سے عائد کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ تحریک پاکستان کے تذکرہ میں یہ حقیقت مزید نکھر کر سامنے آئے گی اور اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ انھوں نے سیاسی جدوجہد میں جو راہ بھی اختیار کی اس کا مقصد بہر نوع اس برصغیر کو غیر ملکی سامراج کے بندھنوں سے نجات دلانا تھا۔ تاریخ کی یہ وہ درخشندہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے جس کی شہادت قائداعظم کے انصاف پسند سیاسی حریفوں نے بھی دی ہے۔ حالات نے انتہائی صاف اور واشگاف انداز میں مسٹر گوکھلے کی اس پیشینگوئی کو سچ ثابت کر دیا کہ

ہندوستان کو جب بھی آزادی نصیب ہوئی وہ جناح ہی کے دماغ کی بدولت ہوگی۔

لاہور سے آپ کو جس قسم کی کتاب کی ضرورت ہو

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور کو ایک کارڈ لکھ دیجئے۔ کتاب آپ کو گھر بیٹھے ہی پہنچ جائے گی!

آخری سہارے

آپ بیتی ــــــ عنایت اللہ

[قارئینِ طلوعِ اسلام نے اس انداز کا کوئی مضمون اس سے پہلے طلوعِ اسلام میں نہیں دیکھا ہوگا
انھیں ہماری اس "بدعت" پر حیرت تو ہوگی لیکن مضمون کی آخری سطروں تک پہنچتے پہنچتے وہ یقیناً
ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ بدعت "بدعتِ حسنہ" ہے جو "ثواب" کا موجب ہوا کرتی ہے۔ دیکھئے!
عنایت صاحب یہ آپ بیتی کس طرح بیان کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام]

ریاضؔ نے کہا تھا کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

میکدے سے نکلنے کے بعد دنیا کس طرح بدل جاتی ہے، اس کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن "میکدے" میں داخل ہونے کے ساتھ ہی انسان ایک ایسی دنیا میں کس طرح پہنچ جاتا ہے جس کا کوئی تعلق اس کی سابقہ دنیا سے نہیں رہتا، اس کا مجھے تجربہ ہے۔ اور اسی تجربہ کے ایک گوشے سے میں قارئینِ طلوعِ اسلام کو متعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اس "میکدہ" اور باہر کی دنیا کے درمیان ایک بہت بڑی دیوار حائل ہوتی ہے۔ باہر والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس دیوار کے اس قدر بلند رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ اندر کی دنیا والے اسے پھاند کر باہر نہ جاسکیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کی بھنک تک بھی اندر والوں کے کان میں نہ پڑنے پائے۔ قرآن نے بھی تو جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار ہی حائل بتائی ہے۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ (الحدید) "ان کے درمیان ایک دیوار حائل کردی جائے گی جس کا (صرف) ایک دروازہ ہوگا"۔ یوں تو اس دروازہ میں داخل ہونے کے ساتھ

ہر ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن جو بدبخت اس شدتِ احساس کے ساتھ اندر جاتے ہیں کہ ـــ ایک طرف تماشہ ہیں، ناکردہ گناہگار ہیں ـــ اس کے دل کی دنیا میں جو قیامت خیز تغیر آتا ہے اس کا اندازہ کوئی اور نہیں لگا سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس بلند دیوار اور اس کے آہنی پھاٹک کے پیچھے بڑی بڑی لرزہ انگیز سزائیں اور ہولناک عقوبتیں سامنے آتی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جگر پاش سزا بے بسی اور انتہائی مجبوری کا احساس ہے جو ایک بدروح کی طرح سوتے جاگتے، کسی وقت بھی قیدی کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اسی بے بسی کا اثر ہے کہ جب ان آہنی سلاخوں کے پیچھے اس پر پہلی رات ہی آتی ہے تو اسے خود اپنی ذات کے متعلق ویرانے سے سب سے پہلے اپنے متعلق ایسی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں جو وہ دوسروں کے متعلق دوسروں کو سنایا کرتا تھا۔ جو قصے کہانیاں وہ دوسروں کے ساتھ وابستہ کیا کرتا تھا وہی قصے کہانیاں اس کی اپنی داخلی دنیا سے ابھر کر اسی کے ساتھ چپکتے چلے جاتے ہیں۔ آواز بلند ہونے لگتی ہیں ـــ "میں نے روکا نہیں تھا تمہیں؟ ...... میں نے کہا نہیں تھا یوں نہ کرو؟ ...... تم نے میری نہ مانی۔ من مانی کی ...... آج تمہارے متعلق ہر جھوٹ سچ ہو گیا ہے ...... قیدی ...... مجرم ...... قیدی ......"

قیدی ان آوازوں سے بھاگ کر تنگ و تاریک کوٹھڑی کے کونوں کھدروں میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی ہستی سے اٹھی ہوئی آوازیں شہد کی چھیڑی ہوئی مکھیوں کی طرح اس کے ادھر ادھر اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ اس کے لئے سوائے اس کے کوئی راہِ فرار نہیں ہوتی کہ وہ تصورِ دل اور حسین یادوں میں گم ہو جائے یا اپنے آپ کو کسی ایسی غیبی قوت کے حوالے کر دے جو اسے اپنی گود میں اس طرح چھپا لے جس طرح بچپن میں جب بجلی کڑکتی تھی تو اسے ماں سینے سے لگا کر اپنی پناہ میں لے لیا کرتی تھی۔

وہ ماضی میں جا چھپتا ہے۔ اُسے باتیں یاد آتی ہیں ـــ کچھ بھولی بسری، کچھ کبھی بارش ہوئی۔ جرم سے پہلے کی کہانیاں، اس سے پہلے کے قصے، اس سے بھی پہلے کی باتیں، بھولی بھالی معصوم سی وارداتیں ـــ اس طرح وہ کہکشاں پر ٹہلتا ہوا ستاروں کے دیس سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ لیکن وارڈر کی وسل کی سخت تیکھی آواز، یا چابیوں کے گچھے کی جھنجھناہٹ، یا کسی ساتھی قیدی کی بیڑیوں کی ہیبت ناک جھنکار اُسے یوں کالی کوٹھری میں واپس لے آتی ہے جس طرح جیل مرغی کے ننھے چوزوں کو پنجوں میں دبوچ کر اپنے گھونسلے میں لا پھینکتی ہے۔ نزع کے وقت بھی شاید انسان اس قدر بے بس، مجبور اور رحم کا طلبگار نہ ہوتا ہو گا جتنا اس وقت ہوتا ہے جب اسے پُرفریب تصورات کے سبزہ زار سے گھسیٹ کر حقائق کے ریگزار میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ تڑپتا ہے۔ مر مر کے جیتا ہے اور جی جی کے مرتا ہے۔ اُسے اپنے آپ میں بھی پناہ نہیں ملتی وہ سہارے تلاش کرتا ہے یا شکست خوردہ ہو کر اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے جب کسی بے گناہ کو سزائے قید دے دی جاتی ہے تو اس کی ذہنی حالت اس سے کہیں زیادہ دگرگوں اور قابلِ رحم ہوتی ہے۔ وہ تنکوں کے سہارے تلاش کرتا پھرتا ہے جیل میں ڈوبتے ہوئے کو تنکوں کے سہارے ہی ملا کرتے ہیں۔ یا پھر اپنے ذہن کے تراشیدہ خدا کو خوش کرنے کے طریقے ایجاد کر لئے جاتے ہیں۔ اس "خدا" کو داڑھی سے، تسبیح کے دانوں سے، قرآن کی آیات کو گا گا کر پڑھنے سے اور پیر جی اور مُلا کے بتائے ہوئے دیگر طریقوں سے خوش کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ سہارے جن میں

ے کچھ کا ذکر اس وقت خود بخود دل کی گہرائیوں سے ابل کر صفحہ قرطاس پر بکھر رہا ہے۔

"یٰسین کی مبینیں پڑھو۔" جب مجھے سات برس کے لئے محبوس کر دیا گیا تو ایک قیدی نے مجھے مشورہ دیا۔ "یٰسین کو ڈھیلا نہ چھوڑنا۔ اس کی مبینیں قاتل کو سُولی سے اتار لیتی ہیں۔"

"میں یٰسین کو جانتا نہیں۔" میں نے کہا۔ "اُس سے ملا دو۔ پوچھ لوں گا۔"

"آپ اتنے پڑھے لکھے ہو کر بھی یٰسین کو نہیں جانتے؟" قیدی کا مُرجھایا ہوا چہرہ بھڑ گیا۔ بولا۔ "کیسے مسلمان ہو کہ تمہیں سورہ یٰسین بھی نہیں آتی؟"

میں بجھ کے رہ گیا۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں سورہ یٰسین اچھی طرح جانتا ہوں تو اس نے مجھے بتایا کہ یوں کرو کہ علی الصبح سورہ یٰسین پڑھا کرو۔ جب پہلی مبین پر پہنچو تو پھر واپس یٰسین پر آجاؤ اور بغیر بسم اللہ پڑھے شروع سے پڑھو۔ پہلی مبین پر پہنچو تو پھر واپس آجاؤ۔ بغیر بسم اللہ پڑھے تین بار یہ عمل کرو۔ تیسری مرتبہ دوسری مبین تک پہنچو تو وہاں سے پھر واپس آجاؤ۔ بغیر بسم اللہ پڑھے تین بار یٰسین سے دوسری مبین تک پڑھو۔ اس کے بعد یٰسین سے تیسری مبین تک آؤ۔ یہاں تکرار نہیں ہوگی۔ پانچویں مبین پر تکرار ہوگی۔ تیسری بار بسم اللہ پڑھو اور چھٹی مبین پر تکرار ہوگی۔ اس کے بعد......"

وہ مجھے قرآن کی اس سورۃ کے متعلق ایسے انداز اور ایسی اصطلاحوں کی زبان میں باتیں سنا رہا تھا جیسے کسی کالے جادو کا عمل اور اس کا اثر سکھا رہا ہو۔ میں اس سے کہنے ہی لگا تھا کہ قرآن کی یوں توہین نہ کرو۔ لیکن اس دوران میں دس بارہ قیدی ہمارے اردگرد جمع ہو چکے تھے اور وہ باری باری "یٰسین کی مبینوں" کی کرامات اور معجزوں کے قصے سنانے لگ گئے تھے۔ اس مجمع میں تین چار آدمی ایسے تھے جو مبین کا نام لیتے یا سنتے وقت انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگاتے تھے۔ ان میں سے جن کی داڑھی تھی وہ ہاتھ داڑھی پر اور بغیر داڑھی والے منہ پہ ہاتھ پھیر لیتے تھے۔ ایک نے مجھے حلفیہ سنایا کہ ایک آدمی نے دن دہاڑے چار آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ وہ بوڑھی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ حوالاتی قیدی بن کر جیل میں آیا تو اس نے راتیں جاگ جاگ کر یٰسین کی مبینیں پڑھیں۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو وہ جونہی عدالت میں داخل ہوا مجسٹریٹ غش کھا کر کرسی سے فرش پر جا پڑا۔ دوسری پیشی پر بھی ایسا ہوا۔ تیسری پیشی پر جب مجسٹریٹ گرنے لگا تو گرتے گرتے اس نے لکھ دیا ــــ "مقدمہ خارج" ــــ اور قاتل صاف بری ہو گیا۔

اس کے بعد مجھے جرأت نہ ہوئی کہ انہیں قرآن کی توہین سے روکتا یا روک سکتا۔ ان معتقدوں میں زیادہ تر لمبی قید والے اور عمر قید والے اسیر تھے جنہوں نے "یٰسین کی مبینیں" اُس وقت پڑھنی شروع کی تھیں جب ان کے مقدمے شروع ہوئے تھے اور تک وقت بھی انہوں نے اس عمل کو جاری رکھا جب انہیں مجرم قرار دے کر طویل ترین سزائے قید دے دی گئی۔ اُس وقت بھی جب انکی اپیلیں ہائی کورٹ نے پھر سپریم کورٹ نے مسترد کر دیں اور قانون اور انصاف نے ان پر ہمیشہ کے لئے دروازے بند کر دیئے لیکن وہ ابھی تک یٰسین کی مبینوں کو ڈھیلا نہیں چھوڑ رہے۔ کیونکہ روایات کی زنجیریں جیل کی دیواروں اور سلاخوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں وہ ابھی تک اس امید کو سینوں میں سجائے ہوئے ہیں کہ ایک نہ ایک دن مجسٹریٹ بے ہوش ہو جائے گا اور گرتے گرتے ان کی رہائی

کے احکام لکھ جائے گا۔

"اگر آپ یٰسین کا اثر دو دن کے اندر دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔" ایک ڈاڑھی والے قیدی نے کہا۔ "تو اس ورد کے ساتھ ڈاڑھی رکھ لیں۔"

یہ ڈاڑھی والے حضرت سات سال کی سزا بھگت رہے تھے اور تین برس سے ڈاڑھی رکھ کر یٰسین کی بینیں پڑھ رہے تھے۔

جیل میں ڈاڑھیوں کی تعداد غیر معمولی ہوتی ہے۔ ڈاڑھیوں کی وہاں تین قسمیں ہیں۔ ایک جو باہر بھی ڈاڑھی رکھتے تھے۔ دوسری قسم۔ جو جیل کے حجام کے کن استرے سے بچنے کے لئے ڈاڑھی بڑھا لیتے ہیں (اور لگے ہاتھوں شریعت کا تقاضا بھی پورا ہو جاتا ہے) اور تیسری قسم ان سزا یافتہ قیدیوں اور حوالاتیوں کی ہوتی ہے جن کی اپیلیں یا مقدمے زیر سماعت ہوتے ہیں۔ اس تیسری قسم کی ایک مثال پیش کرتا ہوں (یہ مثال ایک نہیں، اکثر یوں ہوتا ہے)۔۔۔

ایک پیشہ ور غنڈہ پانچ سال کی سزا سے قید بھگت رہا تھا۔ اس نے اس سزا کے خلاف اپیل دائر کر رکھی تھی۔ میرے ساتھ وہ خاصا بے تکلف تھا۔ میں نے اسے جب بھی دیکھا تین ساڑھے تین انچ ڈاڑھی سمیت دیکھا۔ ایک دن جو دیکھتا ہوں تو اسے پہچاننے میں خاصی دقت ہوئی کیونکہ اس کی ڈاڑھی مونچھوں سمیت غائب تھی۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "کیوں پہلوان! ڈاڑھی کہاں گئی؟" بڑے تحمل اور متانت سے بولا۔۔۔ "بھاجی! کل اطلاع ملی ہے کہ ہائیکورٹ نے اپیل نامنظور کر کے سزا بحال رکھی ہے۔"

"آیۃ کریمہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔" ایک اور سفید ریش نے سورہ یٰسین کو بھی الگ رکھتے ہوئے مجھے پُرزور مشورہ دیا کہ میں آیت کریمہ کا ورد ہر نماز کے بعد ایک سو ایک بار کیا کروں۔ اور اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ اس نے بتایا۔ "حضرت یونس نے یہ آیت مچھلی کے پیٹ میں پڑھی تھی تو مچھلی نے انھیں خشکی پر اگل دیا تھا۔۔۔ میں گذشتہ چار برس سے اس آیت کا ورد بڑی باقاعدگی سے کر رہا ہوں۔"

میں نے جب اس کی سزا کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ساڑھے چار برس کی سزا سے قید لے کر آیا تھا۔ جس میں سے وہ چار برس گذار چکا ہے۔ جب چھ ماہ بعد (سزا ختم ہونے کے بعد) اسے جیل اگل دے گی تو آیت کریمہ کی برکت پر کون یقین نہیں کرے گا۔

ہر نئے قیدی کو پرانے قیدی ورد و وظیفے سکھ دیتے ہیں۔ مجھے بھی جیل میں کتنے ہی عرصہ سینکڑوں وظیفے سکھائے گئے ان میں سے صرف چند ایک پیش کرتا ہوں۔

"یہ یازدہ پارہ ہے۔۔۔۔" ایک عمر قیدی نے مجھ پر رحم خاص کرتے ہوئے چھوٹی سی ایک کتاب مجھے دی اور کہا۔۔۔ "میں آجکل قرآن ختم کر رہا ہوں۔ یہ یازدہ شریف تم لے لو اور ہر صبح گیارہ کی گیارہ سورتیں پڑھ لیا کرو۔ اگر عربی پڑھنا نہیں جانتے تو سطروں پر انگلی پھیر لیا کرو۔۔۔۔

لیکن یہ خیال رکھنا کہ اس میں سورہ نوح بھی ہے۔ یہ سورۃ کبھی بھول کے بھی نہ پڑھنا بلکہ جب قرآن ختم کرو تو بھی سورہ نوح نہ پڑھا کرو۔ کیونکہ اس میں مصیبت ہی مصیبت اور بددعا ہی بددعا

ہے۔ اسے پڑھو گے تو اپنے سب کام بگڑ جائیں گے۔"

یہ خیال رہے کہ یہ قیدی ان پڑھ نہیں تھا، انٹرمیڈیٹ تھا۔ ہر بات آدھی اردو اور آدھی انگلش میں کرتا تھا۔ اور وہ ایسی جماعت کا پیروکار تھا جو اسلام کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتی ہے اور جس کا امتیازی نشان مٹھی بھر سے بالشت بھر داڑھی ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ حضرت عین اور فریب دہی (دفعہ ۴۲۰) کے جرم میں محبوس تھے۔

وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ہم خیال اور بھی تھے اور سورۂ نوح کے متعلق مندرجہ بالا رائے ان کی اپنی نہیں تھی بلکہ ان کی جماعت کے سکہ بند مولویوں کی تھی۔

"میرے بھائی! کیوں جھک مارتے ہو۔۔۔۔" ایک اور نسخہ ملا۔ "خدا کی قسم! ایک طرف سارا قرآن اور دوسری طرف صرف سورہ مزمل۔ صبح سویرے اذان سے پہلے دو نفل پڑھ کے گیارہ مرتبہ سورۂ مزمل پڑھ لیا کرو اور قطب کی طرف تین پھونکیں مار دیا کرو۔ پھر دیکھنا یہ "سالی" دیواریں نہ پھٹ جائیں تو میری ڈاڑھی پیشاب سے مونڈھ دینا۔"

میرے محتاط اندازے کے مطابق جیل میں ہر صبح کم و بیش پانچ سو قیدی گیارہ گیارہ مرتبہ سورہ مزمل (اول و آخر درود شریف) پڑھا کرتے تھے (اب بھی پڑھتے ہیں) گویا وہاں سورہ مزمل پانچ ہزار پانچسو مرتبہ ہر صبح پڑھی جاتی تھی۔ لیکن دیواریں "سالی" نہیں پھٹیں۔ اور یہ فقرہ کہ اگر اس سورۃ کا یہ اثر نہ ہو تو میری ڈاڑھی پیشاب سے منڈوا دینا" دن میں کوئی پچاس مرتبہ سننے میں آتا ہے لیکن دیواریں اپنی جگہ اور ڈاڑھیاں اپنی جگہ سلامت ہیں۔

"ورد و وظیفے میں ایسے ایسے پرہیزوں کی ضرورت ہوتی ہے" ایک تجربہ کار (بلکہ عادی) وظیفہ خوار نے مجھے وثوق سے بتایا۔۔۔ جو جیل میں پورے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا وظیفے کا اثر الٹا ہو جاتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قرآن ختم کرو۔ ایک بار نہیں جتنی بار کر سکو۔ پڑھنے سے تو قرآن دیر میں ختم ہوتا ہے۔ سطروں پر صرف انگلی پھیرتے جاؤ۔ انگلی پھیرنے سے پڑھنے جتنا ہی ثواب ہوتا ہے۔ اس طرح تم ایک رات میں ایک قرآن ختم کر سکتے ہو۔"

"قرآن کا اثر میں بتاؤں؟" قریب بیٹھا ہوا ایک قیدی بول اٹھا۔ "بمبئی میں میرا ایک دوست ہے۔ شراب وہ پیتا ہے، جوا وہ کھیلتا ہے، رنڈیوں کے پاس وہ جاتا ہے۔ غرض کونسی بدکاری اور کونسا گناہ ہے جو وہ نہیں کرتا لیکن وہ ایک کام کرتا ہے۔۔۔" قیدی نے وجد میں آتے ہوئے بتایا۔ "اس نے ایک مولوی رکھا ہوا ہے جسے وہ تین سو روپے ماہوار دیتا ہے۔ اس مولوی کا کام صرف یہ ہے کہ جب وہ آدھی رات کے وقت شراب کے نشہ میں دُھت گھر آتا ہے تو مولوی قرآن کھول کر پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور وہ آدمی قرآن سنتے سنتے سو جاتا ہے۔ مولوی قرآن پڑھتا رہتا ہے۔ جانتے ہو بابو! اس کا اثر کیا ہوتا ہے؟۔۔۔۔ اس نے میری پیٹھ پر تھپڑ نما تھپکی دے کر کہا۔ "رات کو اسے خواب میں سٹہ۔ لاٹری۔ ریس اور ڈربی اور لکی نمبر دکھائی دیتے ہیں جنہیں وہ صبح اٹھ کے لکھ لیتا ہے۔ وہ ان نمبروں پر پیسہ لگاتا ہے۔ پھر کیا ہے بابو! ہر طرف سے دولت کی بارش ہونے لگتی ہے۔۔۔۔ یہ صرف قرآن کا اثر ہے بابو! صرف قرآن کا اثر۔"

جیل میں قرآن خوانی بہت ہوتی ہے۔ جب قیدیوں کو جھاڑو دے کر جیل کی صفائی پر لگنے کا وقت آتا ہے تو قرآن پڑھنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ تعداد جانتی ہے کہ دنیا کا کوئی قانون ان کے ہاتھ سے قرآن لے کر اس کی جگہ جھاڑو نہیں دے سکتا۔ جیل کے قوانین وضوابط اور افسر بھی اس صورت حال سے بے بس ہو جاتے ہیں۔ ایک افسر نے مجھ سے بصد افسوس کہا "ہم جانتے ہیں کہ بارکوں میں قطار در قطار بیٹھے ہوئے یہ قرآن خواں قرآن پڑھنا نہیں جانتے یہ صرف کام اور صفائی سے بچنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ لیکن ہم ان کے ہاتھ سے قرآن چھین نہیں سکتے۔"

انسان جب حالات اور اپنے آپ سے شکست خوردہ ہو جاتا ہے، تمام سہارے اور پناہ گاہیں چھن جاتی ہیں اور جب اپنی ہی ذات لعن طعن شروع کر دیتی ہے تو وہ ہر طرح کے جھوٹے سہارے قبول کر لیتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی
مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

اور جب مولوی کا وعظ اور روایات اور ان کا اثر باقاعدگی سے جیل میں پہنچ رہا ہو تو کون کافر کہہ سکتا ہے کہ یہ سہارے جھوٹے ہیں۔ ایسے ہی ایک سہارے کا ذکر کرتا ہوں۔

اس وقت مجھے "بی کلاس" عطا کر دی گئی تھی (بی کلاس میں سیاستدانوں، لیڈروں، ایڈیٹروں، سکینڈ مصنفوں، ادیبوں اور اس قماش کے لوگوں کو قید کیا جاتا ہے۔ الگ کمرہ مع ضروری فرنیچر اور لکھنے پڑھنے کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ جیل کا اسٹاف احترام سے پیش آتا ہے) دو وارڈروں نے مجھ سے میرے کیس کے متعلق پوچھا۔ میں نے جب انھیں تفصیلات سنائیں تو دونوں نے دلی سے مشورہ دیا کہ میں شاہ جی سے ضرور ملوں۔ شاہ جی کے متعلق انھوں نے بتایا — "انھیں ملنا ہے تو دس روز کے اندر اندر مل لو ورنہ پچھتاؤ گے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "وہ کہیں باہر جا رہے ہیں؟"

"نہیں!" وارڈر نے بتایا۔ "دسویں روز وہ پھانسی چڑھ رہے ہیں۔"

میں نے پھانسی کے لفظ پر حیرت کا اظہار کیا تو مجھے بتایا گیا کہ شاہ جی کو سزائے موت ہوئی ہے اور پھانسی کی تاریخ آچکی ہے شاہ جی کے معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی پھانسی کی کوٹھڑی (CONDEM.VED CELL) کا دروازہ مقفل رہتا ہے لیکن وہ ہر شام اپنے پیر صاحب کے پاس چلے جاتے ہیں اور سارے شہر میں گھوم آتے ہیں۔ نماز باہر مسجد میں پڑھتے ہیں۔ وارڈروں کو وہ کوٹھڑی میں نظر آتے ہیں لیکن وہ دراصل باہر گئے ہوئے ہوتے ہیں۔

"تو وہ اسی کرامات سے فائدہ اٹھا کر پھانسی سے بچ کیوں نہیں جاتے؟" میں نے پوچھا اور یہ بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ ایسی برگزیدہ شخصیت نے ایسا جرم کیا ہی کیوں کہ انھیں سزائے موت مل گئی۔"

"اسی میں تو سارا راز ہے جو کسی کو معلوم نہیں۔" وارڈر نے میرے سینے پر انگلی رکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میری خبری

کے بعد کا درجہ قطب کا ہے۔ اس کے بعد کا درجہ خدا کا ہے۔ شاہ جی کے پہلے تمام درجے پالئے ہیں۔ لیکن قطب کا درجہ سولی پر چڑھ کے حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ سولی پر چڑھ رہے ہیں..... باہر صاحب! جانے کتنے قیدیوں کو وہ ایک ایک پھونک سے بری کروا چکے ہیں۔ انھیں صرف اس مجسٹریٹ یا جج کا نام بتا دو جس کے پاس مقدمہ چل رہا ہو۔ عدالت میں جاتے ہی اتنا کہہ دو۔ "یا شاہ جی کرم دو" اور مجسٹریٹ اندھا ہو جائے گا اور مقدمہ خارج کر دے گا"

پھانسی کی کوٹھڑیوں والے وارڈ میں کسی کا گذر نہیں ہو سکتا۔ کڑے پہرے لگے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود عام قیدی کسی نہ کسی طرح شاہ جی کی کوٹھڑی میں پہنچ جاتے تھے اور گھروں سے آئی ہوئی کھانے پینے کی چیزیں شاہ جی کو دے آتے تھے (قیدی کے رشتہ دار مہینے میں ایک بار صرف چند منٹوں کے لئے قیدی سے مل سکتے ہیں اور گڑ، صابن، پھل، بیڑی اور سگریٹ کی مقررشدہ مقدار اسے دے سکتے ہیں) گھر سے آئی ہوئی یہ اشیاء قیدی کی متاعِ عزیز اور سامانِ حیاتی ہوتی ہیں جسے وہ شاہ جی کی نذر کر دیتے تھے۔ میں نے جب شاہ جی کے متعلق معلومات فراہم کیں تو میں حیران رہ گیا کہ جیل کے عملے کے بھی کئی آدمی ان کے مُرید تھے۔

میں نے ایک جیلر سے شاہ جی کا ذکر کیا تو جیلر نے مجھے شاہ جی کے جرم کی تفصیلات سنائیں۔ مختصراً یہ کہ یہ شخص ایک نوجوان لڑکی کو اس کے گھر دینیات پڑھانے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے اس لڑکی کی جبراً آبروریزی کر ڈالی۔ لڑکی کا جواں سال بھائی موقع پر پہنچ گیا۔ شاہ جی نے چاقو کے چند وار کر کے اُسے قتل کر دیا۔ اور اب چند روز بعد پھانسی پر لٹکنے والے تھے۔

جب شاہ جی کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا تھا (قطب کا درجہ حاصل کرنے کے لئے) تو راستہ میں ان کا دل ڈوب گیا اور ڈیوٹی وارنر نے اسے بتایا کہ اسے دو وارڈر سہارا دے کر تختے کی طرف لے گئے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب قاتل پھانسی کے تختے کی طرف جاتے ہیں تو نعرے لگاتے ہوئے یا کلمہ شہادت یا کوئی آیت پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔ بیشتر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ لیکن مجسٹریٹوں کو اندھا کرنے والے شاہ جی کو اندھوں کی طرح ہاتھ تھام کر بلکہ گھسیٹ کر سولی پر لے جایا اور چڑھایا گیا۔

تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جی تو مر گئے لیکن ان کے معتقد اور کرامات ابھی تک زندہ ہیں۔ لوگ ان کرامات اور روایات کو زندہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ روایات کی موت روایات کو ماننے والوں کی انسانیت کی موت ہوتی ہے۔ جب ان سے روایات چھین لی جاتی ہیں تو ان کی حالت اس آدمی کی سی ہو جاتی ہے جو سیلاب میں ہوا سے بھرے ہوئے مشکیزے پر تیر رہا ہو اور مشکیزے میں سوراخ ہو جائے۔ جیل میں جس شدت اور یقین سے ورد و وظیفے کئے جاتے ہیں ان سے کہیں زیادہ عملی دلائل ان وظائف کے اثرات کی تردید کے لئے خود جیل میں موجود ہوتے ہیں۔ قیدی ہر روز دیکھتے ہیں کہ آج جو قیدی پھانسی چڑھ گیا ہے کونسا ورد اور وظیفہ ہے جو اس نے نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ بچ نہ سکا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ورد وظیفے بدستور جاری ہیں۔ بات یہ ہے انسان انتہائی ناامیدی میں بھی اپنے لئے امیدوں کے سہارے تراشتا رہتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرے تو ایک دن بھی نہ جی سکے۔ ایسے ہم سہاروں کی پُرفریب افادیت جیل کے اندر جا کر معلوم ہو سکتی ہے۔ باہر کی دنیا والے اسے سمجھ نہیں سکتے۔ مجبور اور بے بس قیدیوں کا یہی نازک پہلو ہے جس سے پیر جی اور ملا فائدہ اُٹھاتا ہے اور نت نئے دن ایک نیا وظیفہ اور ورد اور اس کے اثرات فضا میں پھیلا دیتا ہے

اس کے لئے کچھ لوگ اس کے ایجنٹ کی حیثیت سے بھی کام کرتے ہیں۔ لیکن اصل ایجنٹ خود انسان کی بے بسی ہوتی ہے جلاسے اتنا بھی سمجھنے نہیں دیتی کہ اگر پیر جی یا مولوی صاحب کے وظیفہ میں ایسا ہی اثر ہے تو وہ خود جیل کے اندر کیوں سڑ رہے ہیں! لیکن جذبات کی شدت ان منطقی دلیلوں کی طرف آنے کب دیتی ہے۔ جیل خانہ میں کسی کی منطق کچھ کام نہیں دیتی۔ اور پیر اور ملا اسی سے فائدہ اٹھا کر جیل کے اندر بھی دکانداری کرتا ہے۔

قیدی کو جب رشتہ دار ملنے آتے ہیں تو اسے کوئی نہ کوئی نیا ٹوٹکا، ورد یا وظیفہ بتا جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا جاتے ہیں کہ یہ فلاں پیر یا مولوی نے بتایا ہے اور وظیفہ پڑھنے کی اجازت بھی دی ہے۔

"قرآن کی بعض آیات کا ورد ایسا ہے جس کی اجازت کسی نہ کسی پیر سے یا مولوی سے لینا ضروری ہے ورنہ وہ بے اثر۔ آیۃ کریمہ اور سورہ یٰسین کی ایک آیت سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ۔ پڑھنے کے لئے اجازت کی شدید ضرورت ہے۔" ورنہ خدا کا کلام بے اثر جائے گا۔

جیل میں خصوصاً پھانسی کی کوٹھڑیوں میں ہر لمحہ "عبادت" ہوتی ہے۔ بلا مبالغہ ہر لمحہ۔ بعض قیدی کام کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک جاگیردار قید تھا جسے "بی کلاس" دی گئی تھی۔ وہ ان پڑھ تھا اور ایک وظیفہ کر رہا تھا۔ تسبیح ہر وقت ہاتھ میں رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، بیٹھتے اٹھتے، ہلتے کھیلتے تسبیح اس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ ہونٹ اور دانے متحرک رہتے تھے۔ اس نے ایک نوٹ بک رکھی ہوئی تھی جس میں وہ تسبیحوں کا حساب لکیروں کی زبان میں لکھا کرتا تھا جس طرح ان پڑھ بیوی دیوار پر لکیریں ڈال کر دودھ اور دھوبی کا حساب رکھتی ہے۔ وہ تسبیح کے دوران باتیں بھی کرتا تھا۔ باتوں کے دوران اگر کوئی فحش گالی بھی بک جاتا تھا اور اسی میں تسبیح کے چھ سات دانے بھگت جاتے تھے جنہیں وہ نوٹ بک میں لکیر ڈال کر "خدا" کے حساب میں درج کر لیتا تھا۔

میں زندان کی عبادت کا ذکر کر رہا تھا۔ اس عبادت میں نماز کم اور وظیفے ورد زیادہ ہوتے ہیں۔ بعض وظیفے ایسے ہوتے ہیں جن کے دوران گوشت اور نمک کھانا سخت منع ہے۔ "ورنہ اثر الٹ ہوتا ہے"۔ میں نے ایسے قیدی (خصوصاً سزائے موت والے) دیکھے ہیں جنہوں نے مسلسل آٹھ آٹھ روز روٹی نہیں کھائی صرف پانی پر زندہ رہے ہیں۔ کیونکہ جیل میں سب کے لئے اکٹھا کھانا پکتا ہے جس میں نمک ڈالا جاتا ہے۔ بعض قیدی ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر رات رات بھر عبادت کرتے ہیں۔ ایسے وظیفے بھی ہیں جن کے دوران بولنا سخت منع ہے۔ اگر جیل میں کوئی قیدی اشاروں میں "باتیں" کرے تو اسے گونگا بہرہ نہ سمجھئے۔

قرآن کا ایک استعمال اور بھی ہے ـــــ فال نامہ نکالنا ـــــ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ مستند طریقہ یہ ہے کہ کسی جمعرات (چاند کی پہلی جمعرات زیادہ موزوں ہے) صبح سویرے وضو کر کے ایک دعا (جو قرآن کے بعض نسخوں میں لکھی ہوئی ہے) پڑھئے۔ اور قرآن کھولئے۔ جس جگہ سے قرآن کھلے اس کے دائیں صفحے کی پہلی سطر لکھ لیجئے۔ اس سے آگے تیسرے صفحے کی تیسری سطر لکھ لیجئے اور اس سے آگے ساتویں صفحے کی ساتویں سطر لکھ لیجئے۔ یہ ساری تحریر آپ کی روح تقدیر کی تصدیق شدہ نقل ہوگی۔

(تقریباً ہر مسجد کا مولوی فال نکالا کرتا ہے)

"بابو صاحب! قرآن کا لکھا تو کبھی ٹل نہیں سکتا"۔ ایک قیدی نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
میں ایک بات واضح کر دوں کہ یہ حالت صرف جاہل اور ان پڑھ قیدیوں کی نہیں۔ میں نے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کو اس روگ میں مبتلا دیکھا ہے۔ بلکہ ایک عظیم سیاستدان کو بھی میں نے اسی چکر میں الجھا ہوا پایا ــــ بہت بڑا سیاست دان۔ بہت بڑا لیڈر ــــ میں نے اس کے پاس قرآن کا وہ نسخہ دیکھا جس کا ترجمہ انگریزی میں ہے اور جو آجکل نایاب ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ دوسرے ہی روز قرآن سے فال نکال رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ان گنوار اخلاقی قیدیوں سے ورد وظیفے پوچھا کرتا تھا جو ابھی کل تک اس کی رعایا تھے۔ ایک روز میں اس شخصیت کے ساتھ بحث میں الجھ گیا تو لاکھ اس گریجویٹ نے تمام عقلی دلائل کو ایک طرف کر کے قرآن کی کرامات اور معجزوں کی ایک طویل فہرست بنا کر مجھے خاموش کر دیا۔ خاموشی سے بہتر میرے پاس اور کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ اس سند نے مجھے "عملی دلائل" دے کر قائل کرنے کی کوشش کی کہ مصیبت کے وقت قرآن صحیح فال بتاتا ہے۔ حتیٰ کہ میں بھی اس کی باتوں میں آگیا (رحمت ایسی بے بسی انسان سے کیا کچھ کرا دیتی ہے!) اور ایک جمعرات قاعدہ کے مطابق اپنی فال نکالی۔ قرآن کی وہ تین سطریں (جو صفحہ نکلا اس کی پہلی سطر، تیسرے صفحہ کی تیسری اور ساتویں صفحے کی ساتویں سطر) ان کا ترجمہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں۔
سوا ان کے ساتھ نکاح کرو ان لوگوں کے اذن سے اور دو ان کے مہر
آگ میں اور یہ اللہ پر آسان ہے۔ اگر تم بچے رہو گے۔

میں نے تو اپنی رٹ پٹیشن (WRIT PETITION) کی کامیابی یا ناکامی کا حال پوچھا تھا۔ لیکن قرآن کی فال نے جو کچھ مجھے بتایا وہ آپ خود ہی پڑھ لیجئے۔

اس وقت تک میں جیل میں ایک سال پورا کر چکا تھا۔ ابھی چھ سال باقی تھے ــــ چھ لمبے سال ــــ میں نے ہائیکورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کر رکھی تھی جس کی سماعت جاری تھی۔ کسی فضا اور ماحول میں (خواہ وہ خوشگوار ہو یا تکلیف دہ) جذب ہو جانے کے لئے ایک سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔ میں لاشعوری طور پر جیل کے اثرات قبول کرتا جا رہا تھا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ میری (BRAIN WASHING) مکمل ہوتی جا رہی تھی۔ سات برس کا ہیبت ناک عرصہ میری بے بس ہستی پر آتش فشاں پہاڑ کی طرح جھکا رہتا تھا جس میں سے سیاہ کالا دھواں نکلتا رہتا تھا۔ بے بسی اپنی جگہ تھی۔ اور گرد و پیش میں ہر طرف "تسبیحاں"، آیات کا ورد، وظیفے کرامات، معجزے، تعویذ اور روایات تھیں۔ کیا ان پڑھ، کیا لکھے پڑھے اور کیا گریجویٹ۔ سب کی زبان پر "فلاں وظیفے کا فلاں معجزہ" اور "فلاں آیت کی فلاں کرامات" اور ان کے "زندہ ثبوت" کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ ایک طوفان تھا جو ہر روز چاروں طرف سے امڈ کر مجھے گھیرے رہتا تھا۔ بالآخر ــــ دل ہی تو تھا نہ سنگ و خشت

میں نے محسوس کیا کہ میرے پاؤں تلے سے بھی زمین نکلی جا رہی ہے۔ میں اس سے پہلے اپنے عقیدے کی شکست برداشت کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوا تھا۔ معارف القرآن کی دو جلدیں، معراجِ انسانیت، سلیم کے نام خطوط اور طلوعِ اسلام کے تازہ پرچے میرے پاس موجود تھے۔ میں نے ان مطبوعات کے ایک ایک لفظ کو اس طرح مضبوطی سے تھامے رکھا جس طرح کوئی سیلاب میں بہتا ہوا کسی جھاڑی کو پکڑ لیتا ہے۔ لیکن سیلاب کا زور بڑھ رہا تھا۔ جھاڑی ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی۔ میں نے پھر بھی شکست کو تسلیم نہیں کیا مگر تسلیم نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں خود ایک وظیفہ شروع کر چکا تھا۔ ہر رات چار گھنٹے لگاتار بارہ ہزار مرتبہ "یا حیّ یا قیوم" کا ورد۔ باوضو سونا اور خواب کو غور سے دیکھنا، کیونکہ بتلانے والے نے بتایا تھا کہ خواب میں اشارہ ملے گا۔

یہ وظیفہ مجھے جیل کے اسٹاف کے ایک بزرگ ملازم نے بتایا تھا جو خود اس وظیفے سے "فائدہ" اٹھا چکا تھا۔ میں ہی جانتا ہوں کہ مسلسل چار گھنٹے باوضو بیٹھنا کس قدر اذیت ناک کام ہے۔ جبکہ انہی دنوں مجھے GASTRIC کی تکلیف تھی۔ لیکن میں نے یہ اذیت ناک کام کیا، اور چالیس روز کیا۔ اس وظیفے کے جو پرہیز ہیں میں ان کی تفصیلات میں جانے سے گریز کروں گا۔

وظیفہ شروع کرنے سے پہلے میری رٹ پٹیشن کی سماعت میرے حق میں ہو رہی تھی جب وظیفہ نصف کو پہنچا تو ایک روز گھر والوں نے مجھے اطلاع دی کہ ججوں کا رویہ خلافِ توقع بدل گیا ہے۔ شاید رٹ ناکام ہو جائے۔ میں نے وظیفہ بتلانے والے بزرگ کو بتایا تو وہ بڑے وثوق سے بولے کہ تم وظیفہ جاری رکھو۔ چنانچہ میں نے وظیفہ باقاعدگی سے پرہیزوں کے ساتھ جاری رکھتے ہوئے جونہی ختم کیا تو اطلاع ملی کہ ہائیکورٹ نے میری رٹ پٹیشن مسترد کرتے ہوئے سات سال کی سزا بحال رکھی ہے۔ میں نے اپنے پیر استاد کو بتایا تو انہوں نے ایک اور وظیفہ بتایا اور پڑھنے کی اجازت بھی دیدی۔ اس دوران میں مجھے ایک اور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں میں نے دوسرا وظیفہ شروع کر دیا۔ گھر سے اطلاع آئی کہ میری بیوی نے میرے کیس کے ریویژن پٹیشن دائر کر دی ہے۔ میں نے وظیفے میں اور جان ڈال دی۔ لیکن گھر سے آنے والی اطلاعیں بڑی ہی مایوس کن تھیں۔

میرے اپنے ہی سینے میں ایک چنگاری سی سلگی۔ یہ قدرت یا تقدیر کے خلاف احتجاج تھا یا جانے کیا تھا۔ مجھے اسی قدر یاد ہے کہ میں نے غصے میں آ کر وظیفہ نصف میں ہی ترک کر دیا۔ لیکن وظیفے کے متعلق میری رائے دو حصوں میں بٹ گئی۔ میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وظیفے کو ازسرِنو شروع کر دوں یا نہ کروں۔ بہرحال میں نے وظیفہ جاری نہ رکھا لیکن میں اس کے الٹے اثر سے ڈرتا ضرور رہا۔ استاد نے تاکیداً کہا تھا کہ وظیفہ ادھورا نہ چھوڑنا ورنہ پچھتاؤ گے۔ وظیفہ ادھورا چھوڑ دینے کے چند ہی روز بعد اطلاع آئی کہ صدرِ پاکستان نے میری میعادِ قید کے دو سال کم کر دیئے ہیں۔ میں نے اپنی ذات کے دونوں حصوں کو یکجا کر لیا اور میں نے ایک بار پھر اپنے اصلی روپ میں آ کر فیصلہ کر لیا کہ یہ وظیفے اور آیات کا ورد خدا اور قرآن کے ساتھ مذاق اور خود فریبی ہے اور حقائق سے فرار کا "مقدس طریقہ"۔ جب میں نے یہ بوجھ اتار پھینکا تو ایک دن کراچی سے سرکاری تار آیا ——— "عنایت کو فوراً رہا کر دیا جائے"۔ میعادِ قید کا ابھی بمشکل چوتھا حصہ ہی گذرا تھا کہ مجھے رہا کر دیا گیا۔

(باقی صفحہ ۷۶ پر دیکھئے)

ولیم ایل لینگر کے زیر نگرانی

دنیا کے سترہ ممتاز و مشہور تاریخ دانوں کا مرتب کیا ہوا

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم

ترتیب:- ولیم ایل لینگر —— ترجمہ و تہذیب:- غلام رسول مہر

یہ انسائیکلوپیڈیا:- آج کی دنیا میں رونما ہونے والی علمی، تہذیبی اور معاشی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابوں کو سمجھنے کیلئے واحد کتاب ہے۔

یہ انسائیکلوپیڈیا:- مختصر ہونے کے باوجود ماضی کی دنیا میں واقع ہونے والی تبدیلیوں اور انقلابات کا نقشہ بڑی خوبی اور جامعیت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

یہ انسائیکلوپیڈیا:- ماضی اور حال سے باخبر رہنے کیلئے اتنی مفید ہے کہ امریکہ میں اسکے تین ایڈیشن دس لاکھ کی تعداد میں نکل چکے ہیں۔

یہ انسائیکلوپیڈیا:- مولانا غلام رسول مہر نے ترجمہ و تہذیب کے تین جلدوں میں پیش کیا ہے اسلئے یہ اردو ترجمہ اصل کتاب سے زیادہ مفید و مستند ہو گیا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد اول (تاریخ اسلام) یہ جلد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر سنہ ١٩٥٦ء تک مسلمان ملکوں میں رونما ہونے والے تمام اہم واقعات پر مشتمل ہے۔ قیمت:- ١٠/-

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد دوم (تاریخ عمومی) یہ جلد اقوام عالم کے حالات پر مشتمل ہے یعنی ابتداء سے لے کر عہد نپولین کے آخر تک۔ قیمت:- ١٢/-

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم جلد سوم (تاریخ عمومی) عہد نپولین کے بعد سے سنہ ١٩٥٩ء تک کے حالات بڑی جامعیت اور موزوں ترتیب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت:- ١٤/-

یہ تین جلدیں تاریخ کے مطالعہ کے لئے نئی راہیں کھولیں گی۔ ان تینوں جلدوں میں نادر نقشے، شجرہ ہائے نسب اور اشاریوں سے مزین ہیں۔ طباعت خوبصورت ٹائپ میں موٹے ولایتی سفید کاغذ پر کی گئی ہے۔ جلدیں مضبوط اور ڈسٹ کور دلکش اور نظر فریب ہیں۔

(باشتراک مکتبہ فرینکلن - لاہور)

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرنٹرز و پبلشرز

کشمیری بازار لاہور — بندر روڈ کراچی

نقد و نظر

BASES OF ISLAMIC CULTURE

ہندوستان میں (حیدر آباد دکن سے) ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی ہستی متعلمات میں سے ہے (قارئین طلوع اسلام ان سے اچھی طرح واقف ہیں کیونکہ ان صفحات میں ان کا تذکرہ کئی بار آچکا ہے) وہ مسلم تعلیم یافتہ طبقہ کو دین سے آشنا کرنے اور متمسک رکھنے کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں اس سے پہلے کئی ایک عمدہ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر تصنیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں انھوں نے اسلام کے بنیادی تصورات اور اہم قوانین کو ایک ایک کر کے لیا ہے۔ پہلے ان پر (مختصر الفاظ میں) عمومی بحث کی ہے۔ پھر ان سے متعلق قرآن کریم کی آیات اور احادیث مقدسہ درج کر کے ان کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ اس طرح یہ کتاب خدا۔ دین۔ آخرت آزادی فکر و عمل وغیرہ عنوانات سے آگے بڑھ کر اسلام کے سیاسی، عمرانی، معاشرتی، معاشی مسائل تک کو اپنے آغوش میں لے آئی ہے ڈاکٹر صاحب کے انداز بیان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ صاف۔ سادہ۔ دلکش۔ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم سمو دینے کی صلاحیت۔

ہم اس سے پہلے بھی ڈاکٹر صاحب کی بعض تصانیف پر تبصرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب میں اس قدر "جدید" ہونے کے باوجود ہنوز قدامت پرستی کے اثرات باقی ہیں۔ یہ اثرات ان کی زیر نظر کتاب میں بھی نمایاں ہیں مثلاً (۱) وہ "الٰہ" کا ترجمہ "پرستش کے قابل ہستی" کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا صحیح مفہوم "صاحب اقتدار" ہے۔ (۲) وہ بار بار "انسانی فطرت" کا ذکر کرتے ہیں جس کے اندر خیر و شر کی تمیز ودیعت کر دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق نہیں۔ (۳) وہ آدم کو خلیفۃ اللہ فی الارض سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ نے اسے اپنا خلیفہ نہیں بنایا۔ (۴) وہ جہنم کو دھوبی کی بھٹی قرار دیتے ہیں جس میں انسانوں کے گناہ دھل جائیں گے اور وہ یوں پاک اور صاف ہو کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ قرآن کریم سے اس تصور کا اشارہ تک نہیں ملتا (۵) وہ "فنائی اللہ" ہونے کو بھی انسان کا اندرونی تقاضا قرار دیتے ہیں۔ یہ تصورات

دراصل اس خانقاہی ماحول کا نتیجہ ہیں جس میں ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ ہمیں خوشی ہوتی اگر وہ ان اثرات کو الگ کر سکتے اور اس طرح اپنے زیراثر حلقہ کو خالص قرآنی تصورات کی طرف لا سکتے۔ بہرحال اس کے باوجود جو خدمات ڈاکٹر صاحب انجام دے رہے ہیں، وہ ازبس غنیمت ہیں۔

کتاب، انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد (دکن) کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ بقطیع ۲۰×۳۰۔ ضخامت ۳۳۴ صفحات۔ مجلد کی قیمت دس روپے۔ (پاکستان میں ملنے کا پتہ درج نہیں)

۲۔ آسان قرآن

قریب دو سو صفحات کا یہ کتابچہ محترم محمد حسام الدین خاں غوری کی تصنیف ہے جسے دارالادب پاکستان، پٹیل پاڑہ کراچی (۵) نے شائع کیا ہے۔ قیمت تین روپے ہے۔ غوری صاحب نے "حرف اول" میں لکھا ہے کہ سقوط حیدرآباد کے بعد وہ قریب ساڑھے تین سال تک حیدرآباد کے سنٹرل جیل میں محبوس رہے۔ دوران قید میں انھوں نے عربی زبان کی تحصیل اور قرآن کریم کے مطالعہ کا پروگرام بنا لیا (کتنا حسین و جمیل تھا اس "قیدی" کا یہ فیصلہ!) انھوں نے قرآن کریم کو مختلف تفاسیر کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی لیکن

> اس طرح سا علوم قرآن کے مباحث و مقالات کے ہر گوشہ میں کام فرسائی کرنے کے باوجود جو الجھاؤ پیدا ہو جاتے تھے وہ سلجھنے نہ پاتے تھے۔

آخر ایک دن جبکہ ترجمان القرآن پڑھ رہا تھا مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ رائے مطالعہ قرآن کے سلسلہ میں نظر سے گذری اور دل کی گہرائیوں میں اتر گئی:

> اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹا دیئے جائیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیئے ہیں پھر آگے بڑھیں۔ اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحات میں تلاش کریں۔
>
> (ترجمان القرآن۔ جلد اول صفحہ ...)

چنانچہ غوری صاحب نے اس نہج سے قرآن کریم کا مطالعہ شروع کیا اور سورۃ فاتحہ اور آخری پارہ کی آخری انیس سورتوں سے متعلق اپنے فہم قرآن کو زیر تبصرہ کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ پہلے سورۃ متعلقہ کے الگ الگ الفاظ کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ پھر سورۃ کا مسلسل ترجمہ۔ اس کے بعد سورۃ کی مختلف آیات کی تشریح۔ اس سلسلہ میں انھوں نے "حرف اول" میں لکھا ہے کہ جب مولانا آزاد کی مذکورہ صدر بات دل میں جم گئی تو

> میں قرآن کی حقیقت قرآن ہی کے صفحات میں تلاش کرنے لگا۔ نتیجۃً محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے جیسے خارجی موثرات کے پردے ہٹتے جاتے ہیں ویسے ویسے قرآن کی حقیقت ابھرتی جا رہی ہے

اور جو الجھاؤ پیدا ہو گئے تھے وہ سلجھتے جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دعویٰ (تو) نہیں کیا جا سکتا کہ ذہن سے وہ سارے پردے ہٹ گئے ہیں البتہ اس کی کوشش ضرور ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ یعنی بعض مقامات پر قرآنی حقیقت، خالص قرآنی انداز میں ابھر کر سامنے آگئی ہے اور بعض جگہ اُن پردوں کا اثر ہنوز موجود ہے۔ مثلاً انہوں نے سورۂ فاتحہ میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ کا ترجمہ کیا ہے "ہم تیری فرمانبرداری کرتے ہیں"۔ یہ ترجمہ قرآنی حقیقت کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر لکھا ہے۔

> حمد کیساتھ رب العلمین کی صفت کو بیان کرنے کا ایک مقصد یہ بھی واضح ہے کہ حمد کا استحقاق ربوبیت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ پس وہی انسان تعریف و حمد کے قابل اور مقام محمودیت پر فائز ہوگا جو دوسروں کی خدمت کرے گا۔

یہ تشریح بھی صحیح قرآنی تعلیم کی مظہر ہے۔

سورۃ الناس کی تشریح کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھا ہے۔

> اس کے نزول سے متعلق ایک روایت دلائل بیہقی میں ہے کہ رسول اللہ پر لبید یہودی اور اس کی بیٹیوں کے سحر کا اثر ہو گیا تھا۔ آپ نے دعا کی تو یہ سورتیں نازل ہوئیں اور سحر کا اثر زائل ہو گیا۔ گو یہ روایت مسلم اور بخاری میں بھی ہے۔ لیکن قرآن اس کو قبول نہیں کرتا اور یہ قرآن کریم کے نص صریح کے خلاف ہے۔

روایات کے پرکھنے کا یہ معیار قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے۔

دوسری طرف وہ (مثلاً) سورہ الفیل میں وارسل علیہم طیراً ابابیل۔ ترمیہم بحجارۃ من سجیل کا ترجمہ لکھتے ہیں "اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو ان پر کنکر کی ٹھیکریاں پھینکتے تھے (یا ان کو پتھر اور مٹی کے ڈھیلوں پر پھینکتے تھے) یہ انہی تفسیری پردوں کا اثر ہے۔ اس کی وجہ سے محترم مصنف کو خود بھی پریشانی لاحق ہوئی ہے اور سورۃ کا صحیح مفہوم سمجھانے میں انہیں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور اس پر بھی بات نہیں بن پائی۔ اگر وہ "ترمی" کا فاعل وہی لیتے جو "الم تر" کا ہے تو ان کے سامنے حقیقت ابھر آتی۔

بہرحال محترم غوری صاحب کی یہ کوشش قابلِ قدر ہے۔ آج جو شخص بھی قرآن کریم کو قرآن کریم کے صفحات سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ قرآن کی صحیح تعلیم کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے مبارک قدم اٹھاتا ہے۔ اس راہ میں دشواریاں بہت ہیں لیکن جو شخص استقامت سے اس پر چلتا جائے، قرآن اسے وہ نور عطا کر دیتا ہے جس سے اس کا راستہ خود بخود روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے کہیں کہیں محترم مصنف پر مولانا آزاد مرحوم کے انداز کا اثر غالب دکھائی دیتا ہے۔

> قرآن کہتا ہے کہ خدا پرستی کا رشتہ اور عبودیت کا اقرار جہاد و سعی کے التزام کے ساتھ ساری درماندگیوں کا علاج ہے۔

(باقی صفحہ پر دیکھئے)

"لغات القرآن" کی دوسری جلد چھپ گئی

لغات القرآن کی پہلی جلد گزشتہ اپریل میں پیش کی گئی تھی۔ للہ الحمد کہ اب اس کی دوسری جلد بھی چھپ گئی ہے۔ امید ہے کہ (جلد سازی کے بعد) وسط اکتوبر تک شائع ہو جائے گی۔ پہلی جلد قریب پانصد صفحات پر مشتمل تھی۔ دوسری جلد قریب ساڑھے پانسو صفحات پر پھیل گئی ہے۔ اس میں ح سے ش تک کے الفاظ آگئے ہیں۔ ان میں سے بعض اہم عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

خدا سے محبت کا مفہوم۔ حرام و حلال کی تفصیلی بحث۔ حسن کیا ہے اور احسان کسے کہتے ہیں۔ حشر کے معنی کیا ہیں۔ محصنات کون ہیں۔ حق و باطل کیا ہے۔ حکمت کسے کہتے ہیں۔ حکومتِ خداوندی سے مقصود کیا ہے۔ محکمات و متشابہات کی تفصیلی بحث۔ حمد اور تعریف میں کیا فرق ہے۔ حوروں سے کیا مراد ہے۔ حیات و ممات۔ ختمِ نبوت۔ خشیتِ الٰہی۔ کیا آدم خلیفۃ اللہ ہے؟ خمر و میسرہ۔ خوف و حزن۔ عمل خیر کسے کہتے ہیں۔ دابۃ الارض کیا ہے۔ المدثر کا مفہوم۔ دعا سے کیا ہوتا ہے۔ دلوک الشمس سے کیا مراد ہے۔ دین کیا ہے۔ دنیا سے کیا مراد ہے۔ کیا بنی اسرائیل کے بچے سچ مچ ذبح کر دیئے جاتے تھے؟ ذکر خداوندی سے کیا مفہوم ہے۔ مذہب سے کیا مراد ہے۔ رب العالمین کیا ہے۔ ربٰو کی بحث۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" کے معنی کیا ہیں۔ رحیم و رحمٰن میں کیا فرق ہے۔ رسول کسے کہتے ہیں۔ مرشد کون ہو سکتا ہے۔ "رضی اللہ عنہم و رضو عنہ" کے معنی کیا ہیں۔ حضرت عیسٰےؑ کے رفع الی السماء سے کیا مراد ہے۔ رکوع و سجود سے مقصود کیا ہے۔ زوج کی بحث۔ المزمل کی تشریح۔ تسبیح سے کیا مراد ہے۔ سحر (جادو) کیا ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ سے کیا مراد ہے۔ اسلام کسے کہتے ہیں۔ سمٰوات سے کیا مراد ہے۔ قصہ آدم میں شجرہ سے کیا مطلب ہے۔ شریعت کسے کہتے ہیں۔ شرک کیا ہے۔ شیطان کی حقیقت کیا ہے۔ شعر و شاعری قرآن کی رو سے۔ شفاعت کا کیا مطلب ہے۔ شکر کسے کہتے ہیں۔ مشیت خداوندی کیا ہے (تقدیر کا تفصیلی بیان)۔

اس جلد کی قیمت بھی پندرہ روپے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ۔ کتاب حسب ذیل ترتیب سے بھیجی جائیگی۔

(۱) جو حضرات سولہ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں گے انھیں (منی آرڈر وصول ہونے کی ترتیب سے) سب سے پہلے کتاب بھیجی جائے گی۔

(۲) اس کے بعد (فرمائش موصول ہونے کی ترتیب سے) وی۔ پی منگانے والوں کو کتاب بھیجی جائیگی۔

(۳) نقد خریدنے والے 'بیس اکتوبر کے بعد' مکتبہ یا ادارہ سے، (اتوار کے علاوہ) جس دن چاہیں دستی حاصل کر سکیں گے۔

(۴) ہیشگی خریداروں میں سے جن حضرات کے حساب میں کم از کم پندرہ روپے باقی ہیں، انھیں کتاب مکتبہ سے بھیجدی جائے گی۔ جو پیشگی خریدار کتاب نہ منگانا چاہیں وہ براہ کرم بیس اکتوبر تک مکتبہ کو اطلاع فرمادیں۔

(۵) جو حضرات پہلی اور دوسری جلدیں (دونوں) منگانا چاہیں وہ اس امر کی تصریح کردیں۔ پہلی جلد کی قیمت بھی پندرہ روپے ہے۔

(۶) امید ہے کہ بزموں کے نمائندگان کی خدمت میں کتاب حیدرآباد میں پیش کردی جائے گی۔ وہ وہیں قیمت ادا کردیں۔

جملہ خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ :-

مکتبہ طلوع اسلام

۲۷۔ بی ——— شاہ عالم مارکیٹ ——— لاہور

باب المراسلات

مسئلہ اشاعتِ اسلام بہاولپور سے ایک صاحب نے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں کچھ سوالات بھیجے ہیں مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم ان سوالات اور ان کے جوابات کو درج ذیل کرتے ہیں۔

سوالات حسب ذیل ہیں۔

(۱) کیا غیر مسلم اقوام کے درمیان موجودہ دور میں اسلام کو پھیلانے کا کام منظم طور پر کرنا ایک مستحسن اور ضروری کام سمجھا جا سکتا ہے

(۲) کیا مسلمان حکومتوں کی امداد کے بغیر اور مسلمانوں کے موجودہ سیاسی، معاشی بلکہ اخلاقی تنزل کے پیش نظر یہ کام نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

(۳) کیا سبب ہے کہ اسلام میں دوسری اقوام کو جذب کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ حالانکہ افریقہ۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی بت پرست اقوام آج بھی حلقہ بگوشِ عیسائیت ہو رہی ہیں۔

(۴) کیا اس قسم کی تحریک کا عمرہ اثر خود مسلمانوں پر پڑ سکتا ہے۔

(۵) کیا مسلمانوں کی آبادی کا مطلق بڑھ جانا اقوام عالم کی کشمکش کے پیش نظر مفید ہو سکتا ہے۔

(۶) آپ کے خیال میں ایسی تحریک کے لوازم کیا ہونے چاہئیں تاکہ وہ کامیاب ہو سکے۔ یہ خیال رکھتے ہوئے کہ مسلمان حکومتیں کوئی امداد نہ کریں۔ اور نہ رکاوٹ ہی ڈالیں۔

طلوع اسلام۔ ضرورت ہے کہ اس اہم مسئلہ پر سطحی جذبات سے الگ ہٹ کر حقائق کی روشنی میں غور و فکر کیا جائے۔ اسلام نام ہے ایک نظامِ زندگی کا جو خدا کی طرف سے عطا کردہ غیر متبدل اصولوں اور مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ ان اصولوں کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ کر ان کی صداقت کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کر لینا ایمان کہلاتا ہے کسی کے مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان اصول و اقدار کو بلا جبر و اکراہ، دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ صحیح اور سچا

تسلیم کرے۔ اب آپ سوچئے کہ کسی کو اس قسم کا یقین اور اطمینان دلانے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

اس کی پہلی شکل یہ ہے کہ غیر مسلم اہلِ فکر حضرات کو، قرآنی تعلیم کی صداقت، فکری طور پر سمجھائی جائے۔ اس وقت غیر مسلم اہلِ فکر حضرات کا بیشتر طبقہ مغربی مفکرین اور سائنسداں ہیں۔ اگر عالمِ اسلام میں ایسے اربابِ علم و فکر ہیں جو ان مغربی مفکرین (وغیرہ) کو ان کی علمی اور فکری سطح کے مطابق قرآنی تعلیم کی عظمت اور صداقت کا قائل کر سکتے ہیں تو انہیں ضرور ایسا کرنا چاہیئے۔ دنیا کی باگ ڈور اس وقت اہلِ فکر طبقہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے اگر مغرب کے اہلِ فکر طبقہ کو اس انداز سے قرآنی تعلیم کی صداقت کا قائل کرا دیا جائے تو اس کا اثر بہت دور رس ہوگا۔ لیکن اس وقت جو لوگ اشاعتِ اسلام کے کاموں میں نمایاں حصہ لینے کے مدعی ہیں ان میں تو کوئی ایسا اہلِ فکر نظر نہیں آتا جو مغربی مفکرین کی علمی اور فکری سطح پر انہیں اسلام کی عظمت کا قائل کرا سکے۔ کسی ایسے بلند پایہ اہلِ علم و فکر کا ہونا تو ایک طرف رہا، اس باب میں ہماری تہی دامنی کی یہ کیفیت ہے کہ اس وقت (دنیا کی علمی اور معروف زبانوں میں سے) کسی زبان میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں (ہمارا مطلب انسانی تصنیف سے ہے) جسے ہم یہ کہہ کر غیر مسلموں کے سامنے پیش کر سکیں کہ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کیا ہے اور عالمِ انسانیت میں اس کا مقام کیا؟ غیر مسلم تو ایک طرف، خود ہم اپنے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو کوئی ایسی کتاب نہیں دے سکتے جس سے وہ صحیح اسلام کو سمجھ کر اس کی عظمت کے قائل ہو جائیں۔

اس وقت دنیا کی بڑی بڑی اقوام (جو دیگر اقوامِ عالم کی قیادت کر رہی ہیں) اپنے اپنے نظامِ زندگی سے بری طرح تنگ آ چکی ہیں۔ وہ مغربی جمہوریت اور سرمایہ داری کا نظام کہن ہو یا روس کی اشتراکیت کی لباط نو ۔۔۔ سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہی محبوس ۔۔۔ اور انہیں ان "قید خانوں" سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ قرآن انہیں اس جہنم سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس لئے دنیا کے سامنے قرآنی نظامِ حیات کے پیش کرنے کا، اس سے زیادہ ساعد موقعہ شاید ہی کبھی ملا ہو۔

۲۔ اشاعتِ اسلام کی دوسری شکل یہ ہے کہ اقوامِ عالم، مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر اسلام کی طرف کھنچ کر آ جائیں۔ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کے متعلق یہ کہنا قطعاً مبالغہ آمیز نہیں ہوگا کہ مسلمان کی حالت خود اسلام کے راستہ میں روک بن کر حائل ہے۔ جب دنیا کی کسی متمدن قوم کے فرد کے سامنے اسلام کی عظمت اور بلندی کا ذکر کیجئے تو اس کے لبوں پر معنی خیز تبسم بکھر جاتا ہے اور وہ طنز آمیز انداز سے کہہ دیتا ہے کہ اگر اسلام کی تعلیم ایسی ہی ہے تو اس کے ماننے والوں (مسلمانوں) کی حالت ایسی پست کیوں ہے؟ انہیں (مسلمانوں) کو چاہیئے کہ پہلے اسلام کا نسخہ اپنے امراض پر استعمال کریں اور جب ان کی حالت سدھر جائے تو پھر اسے باقی دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ان کا یہ جواب ہم پر کتنا ہی تلخ کیوں نہ گذرے ہے حقیقت پر مبنی۔ کوئی مریض کسی سے یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا کہ اس کے پاس صحت کا مجرب نسخہ ہے۔ کوئی بھکاری کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دولت کمانے کے بہترین طریق سے واقف ہے۔ اگر وہ ایسا کہیں بھی تو لوگ ان کی باتوں کا مذاق اڑا کر آگے چل دیتے

ذرا سوچئے تو سہی کہ ہم ان اقوام کو، جن کے ہم قدم قدم پر دست نگر ہیں، کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ تمہاری مشکلات کا حل ہمارے پاس ہے! افریقہ۔ امریکہ اور آسٹریلیا کی بت پرست اقوام اگر آج حلقہ بگوشِ عیسائیت ہو رہی ہیں، تو اس لئے نہیں کہ انہیں عیسائیت کی تعلیم میں صداقت نظر آتی ہے۔ وہ اس لئے عیسائی ہو رہی ہیں کہ عیسائیت کی طرف دعوت دینے والی اقوام بڑی ترقی یافتہ ہیں۔ وہ بت پرست اقوام سمجھتی ہیں کہ اگر ہم ان کا مذہب اختیار کر لیں گے تو ہم بھی انہی جیسے ہو جائیں گے۔

ان حالات کی روشنی میں ظاہر ہے کہ دنیا کی پست اقوام اسلام کی طرف اسی صورت میں متوجہ ہو سکیں گی جب انہیں دعوت دینے والے مسلمانوں کی حالت ان سے بہتر ہو۔ لیکن یہ صورت بھی اسی وقت تک قائم رہ سکے گی جب تک ان پست اقوام میں تبلیغ کے لئے کوئی ایسی قوم میدان میں نہیں آئے گی جو معاشرتی اور معاشی طور پر مسلمانوں سے بہتر ہو۔

اس سے بھی آگے ایک اور مشکل ہے اور وہ یہ کہ آپ ان غیر مسلموں کے سامنے کونسا اسلام پیش کریں گے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہمارے ہاں بیسیوں فرقے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اسلام کو سکہ بند اور دوسروں کے اسلام کو کھوٹا سکہ قرار دیتے ہیں۔ ہمیں آج تک وہ جگر پاش واقعہ نہیں بھولتا جب ایک (عیسائی) نومسلم ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ وہ فلاں صاحب کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا اب دوسرے فرقے کے لوگ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہے۔ اس نے کہا کہ میں کفر کو چھوڑ کر اسلام لایا تھا۔ لیکن اگر اسلام لانے کے بعد بھی میں کافر ہی رہا تو اس سے اچھا میرا پہلا کفر تھا۔ اس میں کم از کم اپنے ماں بچوں اور بھائی بندوں سے جدا تو نہیں ہوا تھا!

غیر مسلموں میں اشاعتِ اسلام سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے گھر میں یہ فیصلہ کریں کہ اسلام ہے کیا؟ جب ہم اپنے ہاں ایک متفق علیہ اسلام کا فیصلہ کر لیں، تو پھر اسے دوسروں کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ اس وقت جو غیر مسلم اسلام لاتا ہے وہ سنی۔ شیعہ۔ مقلد۔ غیر مقلد۔ احمدی ہوتا ہے، "مسلمان" نہیں ہوتا، حالانکہ جب رسول اللہ کسی کو مسلمان کرتے تھے تو وہ مسلمان ہوتا تھا۔ سنی۔ شیعہ۔ مقلد۔ غیر مقلد۔ احمدی نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ متفق علیہ اسلام کیا ہے جسے تسلیم کرنے سے ایک شخص، شیعہ۔ سنی وغیرہ نہ ہو، بلکہ صرف مسلمان ہو جائے۔

لیکن ہمارے علمائے کرام کی موجودگی میں اس قسم کے متفق علیہ اسلام کے سامنے آجانے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

اشاعتِ اسلام کی موثر ترین شکل یہ ہے کہ کسی ایک خطۂ زمین میں، قرآنی نظامِ زندگی کو عملاً متشکل کیا جائے۔ جب اس نظام کے درخشندہ نتائج دنیا کے سامنے آئیں گے تو پست اقوام تو ایک طرف، امریکہ اور روس تک بھی اس نظام کی صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ یہی وہ طریق تھا جسے نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا جب اپنے مخالفین سے کہا تھا کہ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۵) اے میری قوم! تم اپنی جگہ (اپنے پروگرام کے مطابق) کام کرتے جاؤ میں اپنی جگہ اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ اس طرح تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس گھر کا انجام

کس کے حق میں جاتا ہے۔ (اس دنیا کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے)۔ (تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ) ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ اس طریق سے جب قرآنی نظامِ حیات کے نتائج سامنے آئے تو وہ اس نظام کی صداقت کا زندہ ثبوت بن گئے اور دنیا نے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (۱۱۰/۲) کا عالمتاب نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یہ ہے اشاعتِ اسلام کا موثر ترین طریقہ۔

لیکن یہ طریق اسی خطۂ زمین میں اختیار کیا جا سکے گا جہاں کے ارباب بست و کشاد

(۱) اس حقیقت پر محکم یقین رکھتے ہوں کہ قرآنی نظام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ دنیا کے ہر نظامِ حیات کے مقابلہ میں بلند ترین نتائج پیش کر سکے۔ اور

(۲) وہ اس نظام کو متشکل کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ جاہ پسند۔ سرمایہ دار اور مذہبی قدامت پرست، ہر سہ طبقات کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس نظام میں فرعون۔ قارون اور ہامان تینوں ختم ہو جاتے ہیں اور بلند و بالا انسانیت باقی رہ جاتی ہے۔

(بقیہ آخری سہارے صـ ۶۶)

اس موقعہ پر مجھے چین کے ایک ڈاکٹر اور مریض کا قصہ یاد آگیا۔ ایک بار ایک غیر ملکی نے چین کے کسی شہر میں ایک چینی سے پوچھا کہ یہاں کا قابل ترین ڈاکٹر کون ہے؟ چینی نے جواب دیا ــــ "چو من ٹانگ قابل ترین ڈاکٹر ہے۔ اس نے ایک بار مجھے موت کے منہ سے زندہ نکال لیا تھا"۔ پوچھا "وہ کیسے؟" چینی نے سنایا ــــ "ایک بار مجھے بخار ہو گیا تو میری بیوی نے ایک ڈاکٹر کو بلایا جس کی دوائی سے بخار اور تیز ہو گیا۔ دوسرے دن میری بیوی نے ایک اور ڈاکٹر کو بلایا تو اس کی دوائی سے بخار اور تیز ہو گیا اور میں مرنے کے قریب جا پہنچا۔ آخر میری بیوی نے ڈاکٹر چو من ٹانگ کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آیا اور میں بچ گیا"۔

میں آج سوچتا ہوں کہ اگر میری رہائی کا تار کہیں وظیفہ کے دوران آجاتا تو پرویز صاحب کے ہزار قرآنی دلائل کے باوجود میں کس طرح یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کرتا کہ حضرت! ان وظائف کا اثر میں نے اپنے آپ پر دیکھ لیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ نظری دلائل کیا وزن رکھتے ہیں!

ایک اتفاقی حادثہ انسان کی زندگی کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے!

خط و کتابت کرتے وقت براہِ کرم خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کیجئے۔ تاکہ آپ کی شکایات پر بعجلت کارروائی کی جا سکے۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

رابطۂ باہمی

لاہور — بزمِ طلوعِ اسلام لاہور نے اس بار عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریبِ سعید منانے کا خاص اہتمام کیا اور اس کے لئے دیال سنگھ کالج ہال میں "مقامِ محمدیؐ" کے دلکش موضوع پر پرویز صاحب کے خطابِ عام کا اہتمام کیا گیا۔ تعطیلات کی بنا پر کالج بند تھا لیکن اس کے باوجود جب احبابِ بزم نے کالج کے اربابِ بست و کشاد سے اس مقصد کے لئے ربط پیدا کیا تو انہوں نے بمسرت تمام نہ صرف ہال کے انتظامات بزم کی تحویل میں دے دیئے بلکہ تمام ضروری سہولتیں بھی مہیا کیں۔ اس اہم خطاب کے سلسلے میں بزم نے قد آدم پوسٹر شائع کئے اور ساتھ ہی لاہور کے قریباً تمام ممتاز اخبارات نے نمایاں طور پر چوکھٹوں میں اس اجتماع کا اعلان شائع کیا (بزم ان تمام اخبارات کے تعاون کی سپاس گذار ہے)۔ ٹھیک سات بجے جب پرویز صاحب، مولانا عبدالرب صاحب اور دیگر احباب کی معیت میں تشریف لائے تو کالج کا بیرونی پھاٹک رنگارنگ کے برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا اور ہال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ ہال کے علاوہ ملحقہ گیلری اور برآمدے کی زینیں اور بالائی منزلیں بھی سامعین سے معمور تھیں۔ اس اہم اجلاس کی صدارت مولانا عبدالرب صاحب نے فرمائی اور تلاوتِ کلامِ پاک اور خلیل مرزا صاحب کی بارگاہِ رسالتمآب میں نذرِ تحسین کی پیشکش کے بعد جب پرویز صاحب مائیک پر تشریف لائے تو پوری فضا گوش بر آواز نظر آتی تھی۔ پرویز صاحب نے اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں "مقامِ محمدیؐ" کی عظمت و رفعت کا ذکرِ جمیل چھیڑا اور نوعِ انسانی کے مایۂ ناز اور آخری قافلہ سالارؐ کے مقامِ نبوت کی دلکشائیاں اپنی حقیقی آب و تاب سے جنتِ نگاہ اور فردوسِ گوش بننے لگیں۔ انسانی علم و خبر کا بلند ترین موضوع، مفکرِ قرآن کا حسنِ بیان اور حاضرین کے جذب و شوق کا کیف انگیز سماں! فضا میں وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور حاضرین حسنِ خطاب کی حقیقت کشائیوں پر جھوم جھوم اٹھے۔

وجد و کیف کی فراوانیوں کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آغازِ اجلاس کے ساتھ ہی یکایک بادوباراں کا تند و تیز طوفان حرکت میں آگیا۔ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور آندھی کی یورش سے دو بار ہال کی بجلی فیل ہونے سے بتیاں

گل ہوئیں اور پنکھے بند ہوئے۔ لیکن پرویز صاحب کا خطاب اپنے مخصوص حسن انداز سے برابر جاری رہا اور موسم کی یورش کی تندی سے بے نیاز حاضرین اپنی نشستوں پر پورے جذب و سکون سے خطاب کی روح نوازیوں میں کھوئے رہے۔ اور کوئی ایک شخص بھی نہ اپنی نشست سے اٹھا اور نہ ہی کوئی ایک آواز ہی بلند ہوئی۔ نو بجے کے قریب جب پرویز صاحب کا خطاب ختم ہوا تو طوفان کا جوش و خروش ختم ہو چکا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار میں حاضرین اپنی نشستوں سے یوں پہلو بدل کر اٹھ رہے تھے گویا انہیں یکایک ایک سہانے خواب کی سحر طرازیوں سے جھنجوڑ دیا گیا۔ ان میں سے اکثر اس پلیٹ فارم کی طرف بے تابانہ رُخ کر رہے تھے۔ جہاں، اس پیر مغاں کی دلکش مسکراہٹیں حلقہ احباب پر نچھاور ہو رہی تھیں جس نے زندگی کی تاریکیوں میں قرآنی فکر کی برقی قندیل پھر اس کے مقام بلند پر لا کر رکھ دی اور خفتہ جان ملت میں پھر وہ ولولے بیدار کیں جو قرآنی فکر کا منتہاء و مقصود ہیں۔

پرویز صاحب ہال سے رخصت ہو گئے۔ لیکن حاضرین! وہ اب بھی مختلف ٹولیوں میں جگہ جگہ کھڑے "مقام محمدیؐ" کے اس عظیم و جلیل موضوع سے لطف اندوز ہو رہے تھے جو سورۃ والنجم کی آیات جلیلہ سے پرویز صاحب نے منظر عام پر پیش کیا۔ مقام محمدیؐ کے یہ عظمت آفریں اور حسین و جمیل گوشے آج ان پر پہلی بار بے نقاب ہوئے تھے۔ ان کے قلب و نظر کی یہ لذت شناسیاں ناقابل بیان تھیں۔ یہ سب کچھ ایک مفکر قرآن کا اعجاز ہو سکتا ہے اور بقول

رگِ تاک منتظر تھی اسی بارشِ کرم کی

رپورٹیں

کراچی

پرویز صاحب کی ٹیپ ریکارڈ تقریریں ہر اتوار کو باقاعدگی سے سندھ اسمبلی ہال میں فردوس گوش بنا رہی ہیں۔ موصوف کے دورہ کراچی کے بعد سے احباب کی ایک نئی تعداد کا بھی درس میں اضافہ ہوا ہے۔ حاضری میں اضافہ کی سعی کی جا رہی ہے۔ بزم کے ترجمان میاں عبدالخالق صاحب مغربی ممالک کے دورے پر چلے گئے ہیں اور کاروباری مقاصد کے ساتھ وہاں وہ بزم ہائے طلوع اسلام کی تشکیل اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے مشن کو بھی آگے بڑھائیں گے۔ لائبریریاں حسب معمول کام کر رہی ہیں اور وہاں سے بہت سا لٹریچر مفت بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ بزم کا ماہانہ اجتماع وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ہوتا ہے۔ بزم کے قائمقام ترجمان شیخ محمد شفیع صاحب نے حالیہ اجتماع میں اراکین بزم سے اپیل کی ہے کہ کراچی سے طلوع اسلام کے دس ہزار نئے خریدار پیدا کرنے کے لئے وہ انہیں اپنا پرجوش تعاون پیش کریں۔ اس اپیل کے نتیجہ میں ڈیڑھ صد نئے خریداروں کے نام رجسٹرڈ کئے گئے ہیں۔ شیخ صاحب

نے دیگر بزموں سے بھی اس مہم کو آگے بڑھانے کی التجا کی ہے۔

گوجرانوالہ

بزم کے پندرہ روزہ اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ پچھلے اجتماع میں طلوع اسلام میں شائع شدہ ایک مقالہ بعنوان "بھول بھلیاں" پڑھ کر سنایا گیا۔ اراکین بزم ادارہ کے شکر گذار ہیں کہ تصوف کے جال سے سادہ لوح انسانوں کو بچانے کے لئے اس نے حقیقت کشائی کی کیسی دل نشین راہ اختیار کی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں ادارہ کے پمفلٹوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ برطانیہ میں مقیم چند نوجوانوں کو برائے نشر و اشاعت انگریزی پمفلٹ بھی ارسال کئے گئے ہیں۔ اجتماع میں اتحاد کی ضرورت اور فرقہ بازی کے شرک کو قرآنی دلائل سے واضح کیا گیا۔ اور یہ بھی تفصیلاً بتایا گیا کہ بزم طلوع اسلام نہ تو کوئی مذہبی فرقہ ہے، نہ سیاسی پارٹی بلکہ یہ قرآنی فکر کی اشاعت کی ایک اجتماعی کوشش کا نام ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے متعدد مسائل کو بھی قرآنی روشنی میں نکھار کر سامنے لایا گیا۔

رسول نگر
(ضلع گوجرانوالہ)

خان بہادر قاضی حفیظ الدین صاحب کی صدارت میں بزم کا اجتماع ہوا۔ اراکین بزم کی گذشتہ سست روی کو افسوسناک قرار دیا گیا اور آئندہ کے لئے تمام احباب نے تن دہی سے کام کرنے کا عزم کیا۔ محترم قاضی صاحب موصوف نے قرآنی فکر کو آگے بڑھانے کے لئے احباب سے خاص تاکید فرمائی۔ اور بعد میں "ضبط ولادت" پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔

راولپنڈی

بزم کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ اراکین بزم کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہر جمعہ کو پرویز صاحب کی ٹیپ ریکارڈ تقریر سنائی جاتی ہے۔

پنڈ دادنخاں
(ضلع جہلم)

ادارہ سے موصول شدہ پمفلٹوں کی تقسیم جاری ہے۔ اور اس سے خوشگوار اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ادارہ کی مطبوعات برائے مطالعہ بھی تعلیم یافتہ اصحاب کو دی جا رہی ہیں۔ ہر جمعہ کو بزم کا اجتماع باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ محترم حافظ عبدالمجید صاحب خطیب جمعہ میں قرآنی تعلیم اور اس کے مقاصد کی وضاحت فرماتے ہیں اور اس سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت موثر طور پر ہو رہی ہے۔

سیالکوٹ

بزم پمفلٹوں کی تقسیم اور نشر و اشاعت کے کام میں سرگرم ہے۔ موسمی خرابی اور ہیضہ کی وبا پھیلنے کے باعث گذشتہ دو ماہ میں عام اجتماعات کی صورت قائم نہ رہی۔ اس بنا پر مجلس عاملہ کے ذریعے ہی ضروری امور طے کئے جاتے رہے۔ ٹیپ ریکارڈر کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے۔

سرگودھا

طلوع اسلام کے پیغام اور لٹریچر کی اشاعت ہفت روزہ "خودی" کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ "اطاعت رسول" کا پمفلٹ جو ادارہ کی طرف سے شائع ہوا تھا "خودی" میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔

مری

۱۸ ستمبر کو بزم کا اجلاس بمقام لوئر ٹوپہ محترم کیپٹان محمد رمضان خان صاحب رکن یونین کونسل کی صدارت میں ہوا۔ اجلاس نے بزم مری کے زیرِ اہتمام ایک لائبریری کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اور ۲ تا ۴ احباب نے پچاس ساٹھ روپے کی کتابوں کی پیشکش کر دی۔ ان کتب سے لائبریری کا کام آغاز پذیر ہوا ہے۔ محترم عرفان عباسی صاحب لائبریری کے ناظم مقرر ہوئے ہیں۔

مَردان

بزم سرگرمِ عمل ہے۔ اردو اور انگریزی پمفلٹ احبابِ ذوق میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ پر پرویز صاحب کی تقریر ـــ محمدؐ کی کہانی۔ خدا کی زبانی ـــ دو الگ الگ اجتماعات میں سنائی گئی۔ ان اجتماعات میں زیادہ تر اہلِ علم حضرات تشریف لائے اور ان سب نے اس تقریر کو سراہا اور پسند کیا۔

طلوعِ اسلام کے پُرانے پرچے

بزم کے پاس مندرجہ ذیل طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے ہیں۔ جن احباب کو ضرورت ہو۔ چھ پیسے فی رسالہ بطور محصول ڈاک روانہ کر کے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

(سنہ ۱۹۵۳ء) مئی۔ جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔ دسمبر (سنہ ۱۹۵۴ء) جنوری سے اپریل، جون سے دسمبر (سنہ ۱۹۵۵ء) جنوری، (سنہ ۱۹۵۶ء) مئی۔ نومبر۔ دسمبر (سنہ ۱۹۵۷ء) اپریل۔ مئی۔ جولائی۔ اگست تا دسمبر (سنہ ۱۹۵۸ء) مارچ، جون۔ جولائی۔ ستمبر تا دسمبر (سنہ ۱۹۵۹ء) جنوری سے مارچ۔ مئی۔ جولائی۔ تا اکتوبر (ہفتہ وار) نمبر شمارہ ۳، ۵، ۱۳، ۱۵ تا ۱۸، ۲۰ سے ۲۶، ۲۸، ۳۶ سے ۴۷ اور ۴۹۔

خواجہ محمد حسین۔ ترجمان بزم طلوعِ اسلام۔ حاجی پورہ گوجرانوالہ

(بقیہ نقد و نظر)

آپ دیکھئے۔ اس فقرہ میں پُرشکوہ الفاظ تو ضرور آ گئے ہیں لیکن پڑھنے والے کے سامنے کوئی متعین بات نہیں آتی۔ "خدا پرستی کا رشتہ اور عبودیت کا اقرار"۔ سوال یہ ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے؟ مصنف خود "ایاک نعبد" میں عبودیت کا ترجمہ "فرمانبرداری" کر چکے ہیں، جب عبودیت سے مفہوم "پرستش" نہیں تو پھر "خدا پرستی کے رشتہ" سے کیا مقصود ہے؟ اور "خدا پرستی" اور "عبودیت" کو یکجا لانے سے کیا مراد ہے؟ قرآن کریم کی تعلیم کو پیش کرتے وقت اس امر کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ جو الفاظ استعمال کئے جائیں وہ قرآن کا صحیح، واضح اور متعین مفہوم پیش کریں۔